CONVERSATIONS WITH

TARIQ ALI

SPEAKING OF EMPIRE AND RESISTANCE

سامراج اور مزاحمت

طارق علی سے انٹرویو

ڈیوڈ برسمین

ترجمہ: ارشد رازی

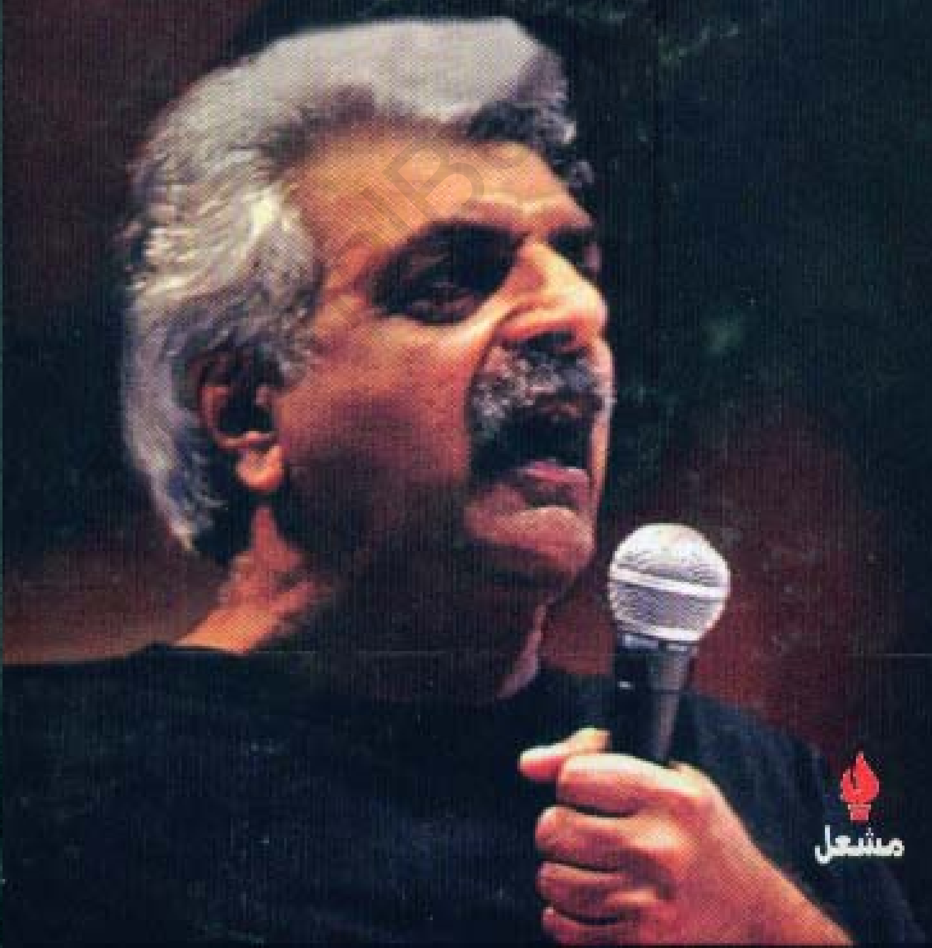

فہرست

سامراج کی واپسی	7
سامراجیت ... تب اور اب	14
بش ـــ بابل میں	37
سامراج میں شگاف	53
پاکستان ـــ جنرلوں کی حکومت	71
سامراج کے علمی ستون	89
فلسطین اور اسرائیل	122
پس لفظ	150

MashalBooks.com

MashalBooks.com

1

سامراج کی واپسی

ایک بار ایک پاکستانی جنرل نے آپ سے کہا تھا، ''پاکستان ایک کنڈوم کی طرح ہے اور افغانستان میں داخل ہونے کے لیے امریکیوں کو اس کی ضرورت تھی۔ ہم نے یہ مقصد پورا کر دیا اور اب وہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں فلش میں بہایا جا سکتا ہے۔اَسّی کے عشرے میں پاکستان اور امریکہ نے ملحد سوویت یونین کو شکست دینے کے لیے مجاہدین کو مالی امداد دی اور مسلح کیا۔ کیا پاکستان کو ایک بار پھر بطور کنڈوم استعمال کیا جا رہا ہے؟

◻ میرا خیال ہے کہ امریکیوں نے وہی کنڈوم پھر ڈھونڈ نکالا لیکن دیکھا تو اس میں بہت سے سوراخ ہو چکے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ایک نیا کنڈوم مہیا کیا اور پھر انہوں نے چڑھائی کر دی۔ اس بار وہ پاکستانی فوج کو استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ اس نے ہی طالبان کو بنایا اور اسے فتح دلوائی تھی۔ ان سے خود اپنی اولاد کو قتل کرنے کی توقع مشکل تھی۔ چنانچہ امریکہ نے پاکستانی فوج کو مجبور کیا کہ طالبان کی پشت پناہی ختم کر دے۔ فوج اس کام پر بڑے تذبذب کے بعد آمادہ ہوئی۔ لیکن اسے یہ کرنا ہی پڑا۔ پاکستانی فوج کا سہارا ختم ہوا تو طالبان تاش کے پتوں کی طرح بکھر گئے۔ اگرچہ ان کا نسبتاً ایک زیادہ راسخ گروہ کچھ دیر تک پہاڑوں میں جدوجہد جاری رکھے گا لیکن ان کا اسلام آبادی طبقہ وہی کرے گا جس کا حکم ملے گا اور بوقت ضرورت غالباً امریکہ کے زیر استعمال بھی آئے گا۔

زیادہ تر امریکیوں کو طالبان کے لیے پاکستانی اور امریکی پشت پناہی کی تاریخ کا علم نہیں۔ آپ نے پچھلے ستمبر میں کہا تھا، ''لوگوں کو تاریخ فراموشی سکھائی جاتی ہے۔'' اس سے آپ کی کیا مراد ہے؟

□ کمیونزم کے انہدام اور سوویت یونین کے زوال کے بعد سے مغرب میں سرکاری اور غیر سرکاری دونوں کلچر تاریخ کے مضمون کو تباہ کرنے پر متفق چلے آ رہے ہیں۔ لگتا ہے گویا تاریخ کو ختم کیا جا رہا ہے۔ یعنی ماضی میں کچھ زیادہ ہی معلومات موجود ہیں چنانچہ بہتر ہے اسے فراموش کرتے ہوئے از سر نو آغاز کیا جائے۔ لیکن جیسا کہ ہر ایک پر واضح ہو رہا ہے کہ تاریخ کے ساتھ یہ نہیں کیا جا سکتا۔ تاریخ گمنام ہونے کو تیار نہیں۔ اگر آپ اسے دبانے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ خوفناک انداز میں واپس آ جاتی ہے۔ اصل میں یہی کچھ ہو رہا ہے۔

مغربی فکر کی ایک بہت بڑی ناکامی یہ ہے کہ ایڈولف ہٹلر کے سوا انہیں اپنا کوئی دشمن نظر نہیں آتا۔ اس طرزِ فکر کا آغاز 1956 کی جنگ سویز میں ہوا تھا جسے میں تیل کی پہلی جنگ کہا کرتا ہوں۔ اس وقت کے برطانوی وزیر اعظم انتھونی ایڈن نے قوم پرست مصری رہنما جمال عبدالناصر کو مصری ہٹلر قرار دیا تھا۔ پھر معاملات اسی نہج پر آگے بڑھتے رہے۔ جب صدام حسین مغرب کا دوست نہ رہا تو اسے بھی ہٹلر قرار دے دیا گیا۔ اسی طرح ملوسیوچ بھی ہٹلر بن گیا۔ کروشیائی فاشسٹوں اور اس ہٹلر کے لیے بوسنیا اور کوسووو کے لڑنے والے ایس ایس دستوں کا ذکر تک نہیں ہوتا۔ اب القاعدہ اور طالبان کو اسلامی فاشسٹ بتایا جا رہا ہے۔ زور اس امر پر ہے کہ اسامہ بن لادن ہٹلر ہے حالانکہ اس کے پاس کوئی ریاستی قوت سرے سے موجود نہیں۔ اگر آپ ذرا سنجیدگی سے غور کریں تو دعوے کی غرابت سامنے آ جائے گی۔ درحقیقت اس افغان گیم میں شامل واحد کھلاڑی جس نے نازیوں کے لیے نرم گوشے کا اظہار کیا ظاہر شاہ ہے جو جنگ عظیم دوم کے دوران افغان تخت پر تھا۔ اسے امید تھی کہ نازی ہندوستان میں برطانیہ کو شکست دیں گے اور ہونے والی تاخت و تاراج کا کچھ حصہ اسے بھی ملے گا۔

اس طرح کے مضحک استدلال کو مانتے چلے جانے کی ایک ہی وجہ ہے کہ تاریخ کو کلیتاً نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ مغرب کی آبادی نہایت زود فراموش ہے جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ پچھلے پندرہ برس میں ٹیلی ویژن پر دنیا کی کوریج زوال پذیر ہے اور دوسری طرف ایک خاص نظریئے کے گرد گھومنے والی فلموں کے سلسلے اور جنگ عظیم دوم پر دستاویزی فلموں کی بھرمار ہوئی ہے۔ ان امور کا احاطہ کرنے والی تاریخ اگرچہ پرانی ہے اس کے باوجود آج بھی سنسنی خیز ہے۔ ٹیلی ویژن نے حالیہ تاریخ کو مکمل طور پر نظر انداز کر رکھا ہے۔ اگر آپ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے ٹیلی ویژن چینلوں کو دیکھیں تو آپ کو پتہ چلے گا کہ باقی دنیا کو دی جانے والی کوریج نہ ہونے کے برابر ہے۔ ان پر تو میکسیکو یا لاطینی امریکہ جیسے ہمسایہ ممالک کو بھی

MashalBooks.com

نظرانداز کیا جا رہا ہے۔اس طرح کی بے خبری جنگ کے زمانے میں بڑی مفید ثابت ہوتی ہے کیونکہ عوام کو کسی بھی وقت فوری اشتعال میں لا کر کسی بھی ملک کے خلاف جنگ چھیڑی جا سکتی ہے۔ یہ سارا عمل بہت خوفناک ہے۔

بیسویں صدی کی آخری جنگوں کو اکیسویں صدی کی پہلی جنگ کے تقابل میں کیوں کر دیکھا جا سکتا ہے؟

□ ایک فرق تو یہ ہے کہ پچھلی جنگیں حقیقی حلیفوں کے مابین لڑی گئیں۔آج اتحادوں میں امریکہ غالب قوت ہے۔ لیکن اسے اپنے ساتھ کھڑے ہونے والے لوگوں کی ضرورت ہے۔مثال کے طور پر کوسوو اور خلیج دونوں جنگوں میں آگے بڑھنے سے پہلے امریکہ کو دوسروں کے اتفاق رائے کی ضرورت تھی۔ اکیسویں صدی کی پہلی جنگ یعنی جنگ افغانستان میں امریکہ نے ہمسایہ علاقوں پر پڑنے والے اثرات یا کسی بھی دوسرے امر کی پروا کیے بغیر من مانی کی۔ میرا خیال ہے کہ اسے اثرات کی کوئی پروا نہیں بصورت دیگر وہ شمالی اتحاد کی طرف سے یوں آنکھیں بند نہ کرتا۔ امریکہ نے شمالی اتحاد والوں کو طالبان جنگی قیدیوں کی ہلاکت کا حکم دیا۔ یہ جنگ کے تمام معاہدوں کی خلاف ورزی ہے۔مغربی ٹیلی ویژن نے ان ہلاکتوں کو کوریج نہ دی لیکن عرب نیٹ ورک قیدیوں کا یہ قتل عام دکھاتے رہے۔ہمیں تو وہی کچھ دکھایا جاتا ہے جسے مغربی ذرائع ابلاغ کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔

آئیڈیالوجی کے استعمال کے حوالے سے یہ سب جنگیں ایک سی ہیں اور ان سب میں نام نہاد انسانی بنیادوں پر مداخلت کا نعرہ لگایا جاتا ہے۔مداخلت کار کہتا ہے کہ ہم یہ سب نہیں کرنا چاہتے لیکن ہمیں وہاں آباد لوگوں کے لیے یہ کرنا پڑتا ہے۔صاف نظر آتا ہے کہ یہ ایک طرح سے ہاتھ کی صفائی ہے کیونکہ وہاں سب طرح کے لوگ آباد ہیں جبکہ مداخلت کا مقصد ان میں سے ایک کی مدد ہے۔ اور اس سے بھی بڑا مقصد مغربی مفادات کا حصول ہے۔ یہ مفادات تزویری بھی ہو سکتے ہیں، اقتصادی بھی اور سیاسی بھی۔ جہاں تک افغانستان کا مسئلہ ہے تو انہوں نے انسانی بنیادوں پر مداخلت کا ڈرامہ بھی نہیں کیا۔ یہ واضح طور پر انتقام کی جنگ تھی اور اس کا مقصد امریکی عوام کو ٹھنڈا کرنا تھا۔ میں وسط نومبر میں کینیڈا میں کینیڈا ٹیلی ویژن پر چارلس کراتھمر کے ساتھ ایک مباحثہ میں شریک تھا۔ میں نے کہا کہ یہ جنگ انتقام کی جنگ ہے۔ کہنے لگا اگر ایسا بھی ہے تو اس میں کیا حرج ہے۔ بے لچک لوگ اور خاص طور پر جو

حقیقت پسند بھی ہیں اس بات کو کھلم کھلا مانتے ہیں۔ امریکہ نے ان مقاصد کے لیے ضروری حربوں میں مہارت حاصل کر لی ہے اور اس میں ذرائع ابلاغ اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

کس طرح؟

□ پہلی جنگ خلیج کے دوران صحافیوں نے خبروں کے سیاسی منتظمین کو چیلنج کر دیا اور کہا کہ وہ ان واقعات کی سرکاری نہج کو قبول کرنے کو تیار نہیں۔ لیکن بلقان اور اب دہشت گردی کے خلاف جنگ کے دوران لگتا ہے کہ صحافیوں نے بھی سرکاری فکر کو تسلیم کر لیا ہے۔ صحافی لندن کی وزارت دفاع یا واشنگٹن کے پینٹا گون میں جاتے ہیں، سنتے ہیں اور بغیر کوئی سوال کیے مان لیتے ہیں۔ لگتا ہے کہ زیادہ تر صحافیوں کو حکومتی جنگی کوششوں پر کوئی اعتراض نہیں۔ وہ واقعات کا دیا گیا انداز مان لیتے ہیں۔ سوویت ذرائع ابلاغ سے متمیز رہنے کے نظریاتی خطوط بھلا دیئے گئے ہیں۔ نیویارک کی جوڈتھ ملر با آسانی برزنیف عہد کے پراودا اخبار کی سینئر نامہ نگار بن سکتی ہے۔

معروضی کوریج کے لیے انفارمیشن اور تعلیم کے متبادل نیٹ ورک ناگزیر ہو چکے ہیں۔ انٹرنیٹ واقعی ایک قیمتی متبادل ذریعہ کے طور پر سامنے آیا ہے۔ سوچتا ہوں کہ اس کے بغیر ہم کیا کرتے۔ تقریباً سارے کا سارا ذرائع ابلاغ پانچ چھ بڑی کمپنیوں کے پاس ہے اور خبروں کے آزاد ذرائع ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

دہشت گردی کے خلاف جنگ میں ٹونی بلیئر بہت نمایاں رہے۔ ان کے جوش وخروش کی کیا وجہ ہے؟

□ بلیئر یہ سب کچھ توجہ حاصل کرنے کے لیے کرتے ہیں۔ اس کا مقصد یہ دکھانا ہے کہ وہ ایک بڑی سلطنت کے حکمران ہیں حالانکہ وہ شمالی یورپ میں واقع درمیانے درجے کے ایک ملک کے وزیر اعظم ہیں۔ میرا خیال ہے کہ کلنٹن نے انہیں بخوشی استعمال کیا تھا لیکن بش انتظامیہ نے شروع میں ان پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ البتہ بعد میں وہ نئی سامراجی جارحیت کا اہم حصہ بن گئے۔ میرا خیال ہے کہ وہ تیسرے درجے کے ذہن کے حامل دوسرے درجے کے اداکار ہیں۔

نوم چومسکی نے نکتہ اٹھایا ہے کہ آئرش ریڈ آرمی کا مالی نیٹ ورک زیادہ تر بوسٹن اور نیویارک

MashalBooks.com

میں ہے لیکن برطانیہ وہاں بم نہیں گراتا؟

□ میرا خیال ہے کہ نوم ٹھیک کہتا ہے۔ لیکن اس نکتے سے بھی تو یہی پتہ چلتا ہے کہ برطانیہ اب سامراجی قوت نہیں رہا اور امریکہ ہی سامراجی قوت ہے۔ اب سلطنت صرف ریاست ہائے متحدہ کو کہا جا سکتا ہے۔ یہ اس وقت کی واحد سلطنت ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ جنگ نیٹو کی اعلیٰ کمان کے تحت نہیں ہو رہی۔ اسے ایک طرف کر دیا گیا ہے۔ دہشت گردی کے خلاف اتحاد کا دوسرا نام امریکہ ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کی حکمت عملی میں کسی طرف سے کوئی مداخلت نہ ہو۔ جب جرمنی نے دو ہزار سپاہیوں کی پیشکش کی تو رمزفیلڈ نے کہا کہ اس نے ایسی کوئی درخواست نہیں کی تھی۔ اس کے منہ سے یہ کھلم کھلا بیان بہت عجیب لگا تھا۔

ایک حالیہ مضمون میں آپ نے دسویں صدی کے سیکولر عرب شاعر ابوالعلی المعری کی ایک نظم کا حوالہ دیا تھا:

''دربار میں سے گزرتی ہوا سرسراتے ہوئے کہتی ہے کہ یہی وہ باجبروت بادشاہ
تھا جس نے کبھی کمزور کی سسکیاں نہیں سنی تھیں۔''

ذرا اس کمزور کی آواز کے متعلق کچھ کہیے۔

□ کمزوروں کی سسکیوں سے میری مراد نوآزادانہ پالیسیوں کا شکار ہونے والوں کی سسکیاں ہے۔ اور دنیا میں ایسے لوگ کروڑوں کی تعداد میں ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے وطن چھوڑے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو افریقہ سے یورپ جانے والے جہازوں کے نیچے پیٹ کے ساتھ چمٹ جاتے ہیں۔ ایسا کرتے ہوئے وہ اپنی موت کی پروا بھی نہیں کرتے اور ان میں اکثر موت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان کی یہ مایوسی گلوبلائزیشن کا نتیجہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا کمزور لوگ کبھی اپنے آپ کو اتنا منظم کر سکیں گے کہ اپنی حالت بدل سکیں یا کبھی اس قابل نہیں ہوں گے؟ کیا کمزور اندرونی طور پر اتنی سیاسی طاقت حاصل کر سکیں گے کہ وہ کبھی حکمرانوں کو چیلنج کر سکیں؟ لوگوں میں یہ احساس بڑھتا جا رہا ہے کہ گلوبلائزیشن کے حالیہ دورانیے میں خود جمہوریت کچلی جا رہی ہے اور یہ بھی کہ سیاست ایک لغو شے ہے۔ اور کوئی تبدیلی نہیں لا سکتی۔ عالمگیر سطح پر یہ ایک خطرناک صورتِ حال ہے۔ کیونکہ جب ایسا ہوتا ہے تو دہشت گردی شروع ہو جاتی ہے۔ دہشت گردی کمزوری ہی سے جنم لیتی ہے، طاقت سے نہیں

اور یہ مایوسی ہی کی مظہر ہوتی ہے۔

المعری ایک عظیم متشکک شاعر تھا۔ اس نے قرآن مجید کی پیروڈی لکھی تھی۔ اس کے دوست اسے چھیڑا کرتے تھے، ''لیکن، المعری! تمہارے ''قرآن'' کی تلاوت کوئی نہیں کرتا۔'' وہ جواباً کہتا، ''ہاں، مگر مجھے وقت دو۔ اگر لوگ بیس برس اسے پڑھتے رہیں تو یہ بھی اتنا ہی مقبول ہو جائے گا۔'' وہ اسلام کا اچھا دور تھا؛ اس میں لوگ کسی بھی اتھارٹی کو چیلنج کر لیتے تھے۔ ہم جس دنیا میں سانس لے رہے ہیں وہ اس سے بہت مختلف ہے۔ اب مسلمان بھی بیشتر پروٹسٹنٹ پیورٹنز کی طرح روحانی ظاہر بین بن گئے ہیں اور محض لفظوں میں الجھ کے رہ گئے ہیں۔ وہ اسلامی تاریخ کے بارے میں حقیقت پسندانہ مباحث سے گریز کرتے ہیں اور فوراً بنیاد سے رجوع کرتے ہیں۔

> اور آج کی دنیا میں امریکہ دہشت گردی کے خلاف ایک طویل جنگ کی منصوبہ بندی کر رہا ہے۔ وہاں کچھ اس قسم کی باتیں سنائی دے رہی ہیں کہ یہ جنگ دس یا پندرہ برس تک جاری رہے گی۔ اور یہ کہ اس میں ساٹھ تک ملک شامل ہو سکتے ہیں۔ بش انتظامیہ ہمیں تقریباً روزانہ یاد دلاتی ہے کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ ابھی ابتدائی دور میں ہے۔ اس سے کیا مراد ہے؟ اور اس کا کیا مقصد ہے؟

□ اس کا اہم ترین مقصد دنیا کے نقشے کو امریکی پالیسی اور مفادات کے مطابق نئے سرے سے ترتیب دینا ہے۔ قدرتی وسائل محدود ہیں اور امریکہ اس امر کی یقین دہانی چاہتا ہے کہ اس کی آبادی کو یہ وسائل میسر رہیں۔ چنانچہ اس کا پہلا کام یہی ہوگا کہ دنیا کے تیل پیدا کرنے والے خطوں پر کنٹرول حاصل کر لے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ جنگ تیل کی خاطر چھیڑی گئی۔ میں اس پر یقین نہیں رکھتا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ جنگ خطے میں امریکی معیشت کے غلبے کے لیے استعمال نہیں ہوگی۔ اور ظاہر ہے کہ تیل کو اس میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

مشرق وسطیٰ میں امریکہ کا ایک بڑا مسئلہ ہے کہ عراق اور شام شروع ہی سے اسرائیل کے لیے خطرہ بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اور عراق کے پاس تیل کے بہت بڑے ذخائر ہیں۔ سفاک ہنری کسنجر نے بھی ایک بار کہا تھا ''ہم عربوں کو تیل پر قابض کیوں رہنے دیں''۔ چونکہ اسرائیل اس خطے میں امریکہ کا مرکزی اتحادی ہے تو ظاہر ہے کہ امریکہ اس کے طاقتور

مخالفین کو کمزور کرنے کی کوشش کرے گا۔ یہی مقصد حاصل کرنے کے لیے عراق پر حملہ کیا گیا، اور شام پر بھی حملے کا امکان ہے۔ یہ پالیسی اپنے بنانے والوں کے لیے بے حد خطرناک ہے۔ کیونکہ اس میں عام لوگوں کے ردعمل کو بالکل نظرانداز کیا گیا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا عوامی ردعمل کا لاوا پھٹ سکتا ہے؟ تو آپ دیکھیں گے کہ سعودی عرب جیسے ممالک بھی متاثر ہوں گے۔ اگر سعودی عرب کا شاہی خاندان اتار پھینکا گیا تو کچھ لوگ واویلا کریں گے۔ لیکن اگر ان کی جگہ امریکہ کی حمایت یافتہ یا اقوام متحدہ جیسی امریکی لبادہ اوڑھے حکومت آ گئی تو کیا معاملات سدھر جائیں گے؟ اس طرح متحدہ امارات جیسے بدعنوان سلطان بھی ٹکڑوں میں بٹ جائیں گے۔ پھر امریکہ کیا کہے گا۔ کیا اسرائیلی اس سارے خطے میں تیل کے محافظوں کا کردار ادا کریں گے؟ اس کے نتیجے میں مستقل گوریلا جنگ شروع ہو جائے گی۔ تو پھر کیا امریکی اور یورپی اس خطے کی حفاظت کریں گے؟ اس کا نتیجہ بھی لمبی گوریلا جنگ ہی کی صورت میں نکلے گا۔ یہاں حکومت کرنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ لوگوں کی ایک کثیر تعداد کو قتل کر دیا جائے۔

عراق کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں؟

□ الگ تھلگ رہنے کی نئی پالیسی سے جی لبھانے کے بعد اب امریکہ یہ فیصلہ کرنے کے درپے ہے کہ وہ پوری دنیا کو چلائے گا تو اسے کھل کر پوری دنیا سے کہہ دینا چاہیے کہ ... ''ہم دنیا کی واحد سامراجی طاقت ہیں اور ہم سب پر حکومت کریں گے، اور اگر تم اسے پسند نہیں کرتے تو تمہیں اس کی سزا بھگتنا پڑے گی۔'' امریکی سامراجیت ہمیشہ سے ایک ایسی سامراجیت رہی ہے جو سامراجیت کہلانے سے خوف زَدہ تھی۔ مگر اب وہ کھل کر سامنے آنے کا آغاز کر رہی ہے۔ اور ایک طرح سے یہ اچھی بات ہے تاکہ ہمیں معلوم تو ہو کہ کہاں جھکنا ہے اور کہاں کورنش بجالانا ہے۔

2

سامراجیت... تب اور اب

'سامراجیت' کا لفظ امریکہ میں عام طور پر مہذب گفتگو میں استعمال نہیں کیا جاتا۔

◘ میں نے پورے امریکہ میں جب بھی سفر کیا ہمیشہ حیران ہوا کہ امریکی اس لفظ کو پسند نہیں کرتے۔ اس کی ایک وجہ تو سرد جنگ ہے۔ اور دوسرے یہ کہ اس سے امریکہ کا اپنا امیج مجروح ہوتا ہے لیکن جب برطانوی سامراج کو عروج حاصل تھا تو یہ لفظ پورے شد و مد سے استعمال ہوتا تھا۔ امریکہ کے آزاد رسائل مستقلاً برطانوی سامراج پر حملے کرتے رہتے۔ دوسری جنگ عظیم کے وقت ''نیو ری پبلک'' میں شائع ہونے والے سلسلہ وار مضامین میں تو یہاں تک کہا گیا ہے کہ امریکہ کے لیے ہٹلر اور برطانوی سامراج میں سے کسی ایک کا ساتھ دینے کی کوئی بنیاد نہیں۔ چونکہ امریکی ریاست نے برطانیہ سے آزادی حاصل کی تھی اس لیے برطانوی سامراج سے یہ مخاصمت ایک مدت برقرار رہی۔ چنانچہ امریکی یہ بات تسلیم کرنے میں متامل ہیں کہ خود ان کا ملک شروع ہی سے سامراجی طرز عمل اختیار کیے ہوئے ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ سامراجی طاقت وہ ہے جو باہر نوآبادیوں میں قابض ہو اور وہاں حکومت کرنے کے لیے اپنے ملک سے افراد بھیجے۔ جیسا کہ برطانیہ ہندوستان پر، فرانس الجزائر پر، جرمنی نمیبیا پر یا بیلجیم کانگو پر قبضہ جمائے ہوئے تھا۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ ... ''دیکھو ہم تو ایسا نہیں کرتے۔''

بے شک امریکہ اس طرح تو نہیں لیکن کرتا یہی کچھ ہے۔ اس کی داخلی توسیع پسندی کو دیکھیے۔ اس نے مقامی آبادی کو فتح اور برباد کیا پھر ہمسایہ ممالک کی طرف توجہ فرمائی اور میکسیکو کے ٹکڑے کیے اور پھر انہیں ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ضم کرایا۔ امریکہ نے تقریباً وہی کیا جو زار کے زمانے میں روس نے کیا تھا، یعنی اڑوس پڑوس کے ممالک کو روسی سلطنت کا حصہ بنا کر ہضم کر لیا۔ یہاں بھی مفتوحہ علاقے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا حصہ بن گئے۔

پھر امریکیوں کو آگے بڑھنے کا ایک مختلف طریقہ سوجھا۔ امریکی سامراج نے انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں ایک من گھڑت نظریے (Monroe Dectrine) کے تحت لاطینی امریکہ پر کنٹرول حاصل کرنے کے لیے بڑی تیزی سے کام کیا۔ اس نظریہ کے مطابق ان کا کہنا تھا ''لاطینی امریکہ ہمارا عقبی صحن ہے چنانچہ ہم یہاں کسی قسم کی گڑ بڑ برداشت نہیں کر سکتے۔'' سر آپ دیکھیے کہ پہلے وسطی امریکہ میں اور پھر پورے لاطینی امریکہ میں کتنی بار فوجی مداخلت کی گئی اور ہر بار امریکہ کے قومی مفادات کے نام پر مداخلت کی گئی۔ یہی وہ زمانہ تھا، جبBanana Republic کی اصطلاح وجود میں آئی۔ کیونکہ امریکی کمپنیاں ان ممالک میں داخل ہو رہی تھیں جبکہ ان کی پشت پر فوجی ہوتے تھے۔ وہ ان علاقوں کو اپنی کمپنیوں کے لیے محفوظ بناتے تا کہ امریکی سامراج پھل پھول سکے اور فتح و کامرانی سے ہمکنار ہو۔

تاہم ایک لمبے عرصے تک امریکی اپنے کُرّے تک محدود رہے۔ جس چیز نے انہیں آگے بڑھنے پر مائل کیا وہ نوآبادیوں پر قابض ہونے کی خواہش نہ تھی، کیونکہ انہیں ایسا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ انہیں وسیع رقبہ اور بے پناہ قدرتی وسائل میسر تھے۔ وہ جنوبی امریکہ پر پہلے ہی غلبہ حاصل کر چکے تھے۔ جس بات نے انہیں باہر نکلنے پر مجبور کیا (فلپائن کو چھوڑ کر) وہ پہلی جنگ عظیم بھی نہیں تھی۔ اصل میں اس کا باعث روسی انقلاب تھا۔ یہ ایک دلچسپ متوازی عمل ہے کہ عین اس وقت جب روسی انقلاب برپا ہو رہا تھا وڈرو وِلسن نے فیصلہ کیا کہ امریکی مداخلت کے لیے یہی موزوں وقت ہے۔ امریکی منصوبہ سازوں کو خدشہ لاحق تھا کہ اگر یورپی سرمایہ دارانہ نظام مفادات کو یورپ میں خطرہ لاحق ہوا تو آگے چل کر بالآخر امریکہ کو ہی اس کا شکار ہونا پڑے گا۔ تبھی انہوں نے دنیا میں ہر طرف آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا۔ تب تک وہ علاقائی سامراجی طاقت ہونے کے تصور سے بہت خوش تھے۔ اس فیصلے نے بنیادی طور پر امریکہ اور باقی دنیا میں سیاست کا طریق بدل ڈالا۔

البتہ یہ دلیل دی جا سکتی ہے کہ یہ ایک سمت تھی جس پر چلنا ان کی مجبوری تھی۔ پرانی سامراجی قوتیں دم توڑ رہی تھیں۔ چنانچہ جلد یا بدیر کسی نئی طاقت کو ان کی جگہ لینا ہی تھی۔ اور یہ طاقت امریکہ تھی۔ ادھر روسی انقلاب کی کامیابی کا مطلب یہ تھا کہ امریکہ کو بین الاقوامی سطح پر ایک دشمن کا سامنا ہوگا۔ اور وہ ایک ایسا ملک تھا جس نے کھلے بندوں سرمایہ داریت کو چیلنج کیا تھا کہ ''ہمیں ایسا نظام وضع کرنا ہے جو تمہارے نظام سے بہتر ہوگا۔'' چنانچہ وہ ستر برس تک

اس نظام کے خلاف سیاسی، معاشی اور فوجی سطح پر نبرد آزما رہے۔ سوویت یونین کو مجبور کر دیا کہ وہ امریکہ کا ہم قدم رہنے کے لیے غیر ضروری فوجی اخراجات کرتا رہے۔ اس عمل نے امریکیوں کو حتمی فتح دلائی۔ ''اکانومسٹ'' نے اظہارِ مسرت کے طور پر سرخی جمائی ''نئے سرے سے مسلح ہونے کی مسرت'' سوویت یونین پر نہ تو حملہ کیا گیا اور نہ ہی اسے فوجی طور پر شکست دی گئی۔ لیکن وہ اندر سے بکھر کے رہ گیا۔ یہ سرمایہ داریت اور امریکہ کے لیے ایک عظیم فتح تھی۔

سامراجیت، سرمایہ داریت سے کس حد تک متعلق ہے یا کس حد تک اس سے اخذ کی گئی ہے، یعنی اس کا ثمرہ ہے؟ آپ نے روسی توسیع پسندی کی بات کی۔ اس میں یہ اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ سوویت یونین کی بھی محکوم ریاستیں تھیں۔

□ دوسری جنگ عظیم کے بعد روسی توسیع پسندی کا، معاشی استحصال سے کوئی تعلق نہیں بنتا بلکہ یہ عمل جغرافیائی اور فوجی اعتبار سے اس کی ضرورت تھا۔ اس کا مقصد امریکہ کو فاصلے پر رکھنے کے لیے ریاستوں کا ایک نیٹ ورک قائم کرنا تھا۔ یہ امریکہ اور برطانیہ کے ساتھ مشہور معاہدے کا نتیجہ تھا جو 1945ء میں یالٹا (Yalta) میں ہوا تھا۔ روز ویلٹ اور چرچل نے سٹالن سے کہا تھا کہ ... ''تم پولینڈ، ہنگری اور چیکوسلواکیہ کو اپنے قبضے میں رکھ سکتے ہو، یوگو سلاویہ آدھا آدھا ہوگا، جبکہ یونان ہمارا ہے، چنانچہ اگر وہاں انقلابی تحریک شروع ہوئی تو ہم اسے کچل ڈالیں گے، اور تم اس میں دخل نہیں دو گے، تو یوں سارا معاملہ طے پایا۔

لیکن اسے ایک طرف رکھیے، کیونکہ یہ اب زیادہ تر تاریخ کا حصہ ہے۔ پہلے تمام سامراجی طاقتیں اس لیے وجود میں آئیں کہ انہیں سرمایے میں توسیع درکار تھی، انہیں سرمایے کے فروغ کے لیے نئی منڈیوں کی ضرورت تھی۔ منڈیوں کی تلاش نے ہی برطانیہ، ہالینڈ، بیلجیئم اور فرانس کو سامراجی طاقتیں بنایا۔ پہلی جنگ عظیم نوآبادیوں میں اضافے کے لیے لڑی گئی۔ یعنی کون تجارتی شاہراہوں پر قابض ہوگا اور کون منڈیوں پر تسلط جمائے گا؟ جرمنی نے بھی جو بعد میں متحد ہوا اور دوسروں کی نسبت دیر سے سرمایہ داری کی جانب راغب ہوا، فیصلہ کیا کہ اسے ایک سامراجی طاقت بننا چاہیے۔ اس نے محسوس کیا کہ اس مقصد کے لیے برطانیہ کو شکست دینا ہوگی۔ اسی صورت میں وہ آگے بڑھ سکے گا۔ ماضی میں یہی کچھ ہوتا رہا۔

کچھ عرصہ تک یہ تو سب کچھ ڈھکے چھپے ہوتا رہا۔ جب تک سوویت یونین اور مشرقی

MashalBooks.com

بلاک قائم رہا سامراجیت کا تذکرہ ہوتا رہا۔ تاہم یورپ کی کثیر آبادی اس صورتِ حال کو دشمن کے ساتھ جنگ کا حصہ سمجھتی تھی۔ وہی دشمن جسے ریگن کے ایک تقریر نویس نے شیطانی سامراج قرار دیا تھا۔ اب ایک منظر صاف ہو گیا ہے۔ اب دنیا ہمارے سامنے ننگی ہے، کہ کہاں کیا ہو رہا ہے۔ ستمبر 2002 میں بش انتظامیہ کی طرف سے تیار کی گئی ''قومی دفاع کی حکمت عملی'' نے سب کچھ روز روشن کی طرح واضح کر دیا ہے۔ وہ ''آزادانہ تجارت'' کی بات کرتے ہیں آزادانہ سے ان کی مراد ... ان کی مرضی اور ان کے گھڑے ہوئے اصولوں کے مطابق ... ہے اور یہ ان کا ''مقدس اخلاقی ضابطہ'' ہے اور ان کا کہنا ہے کہ اس کے تحفظ کے لیے وہ جنگ سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ اور یہی تمام سامراجی طاقتوں کا 'ضابطہ' ہے۔

امریکہ اور پچھلی سامراجی طاقتوں میں فرق یہ ہے کہ امریکہ عام طور پر اپنے مقامی گماشتوں اور حکمرانوں کے ذریعے کام آگے بڑھانے کو ترجیح دیتا ہے۔ امریکی براہِ راست حکمرانی پسند نہیں کرتے کیونکہ وہ جانتے ہیں اس پر زرِ کثیر صرف کرنا پڑتا ہے۔ جب وہیں سے تابع فرمان حکومت چلانے والے مل جائیں تو اپنے آدمی کیوں بھیجے جائیں۔ امریکیوں نے ہمیشہ یہی طرزِ عمل اختیار کیا ہے۔ مثال کے طور پر، دوسری جنگ عظیم کے بعد جاپان پر تسلط کے دوران انہوں نے ایک آئین وضع کیا تب میک آرتھر کی حیثیت ایک وائسرائے کی تھی۔ لیکن کچھ سالوں کے بعد اسے الگ کر دیا، اور جاپان کی حکومت وہاں کے مقامی مگر اپنے تابع افراد کے سپرد کر دی۔ اور وہ اب بھی یہی کچھ کرتے ہیں۔ جاپان میں جاپانی لبرل ڈیموکریٹک پارٹی امریکہ نے ہی بنائی اور مخصوص اہداف اس کے سپرد کر دیے جو اس پارٹی والوں نے بڑی ذمہ داری کے ساتھ پورے کیے۔ تاہم امریکہ نے اوکی ناوا میں اپنے کچھ دستے رکھ چھوڑے، تاکہ کام زیادہ ہی بگڑ جائے تو خود قابو پا سکے۔

یہ امریکیوں کا طرزِ کار ہے۔ بڑی دلچسپ بات ہے کہ افغانستان تک میں بھی، جو اَب ایک نو آبادی کی حیثیت اختیار کر گیا ہے، وہ عام انتخابات کے التوا کے لیے وہاں موجود اپنے لوگوں کو استعمال نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے کابل میں سی آئی اے اور Unical آئل کمپنی کے پرانے دوست حامد کرزئی کی کٹھ پتلی حکومت قائم کی۔ اس نے ان کے لیے کام کیا حالانکہ اس کی مسلسل حفاظت کرنا پڑی اور اسے غیر محفوظ نہیں چھوڑا گیا۔ اگر مغربی دستے واپس ہو گئے تو وہ زیادہ دیر تک نہیں رہ سکے گا۔

اب یہ سوال اٹھتا ہے کہ امریکہ کے مدمقابل کون ہیں؟ اور وہ ان کے خلاف اپنے

مفادات کا تحفظ کس طرح کر سکے گا۔ ایک تو یورپ ہے جو سیاسی یا فوجی اعتبار سے نہیں محض معاشی لحاظ سے مدمقابل ہے۔

یورپی یونین مدمقابل نہیں ہے کیونکہ اس کا وجود کمزور ہے۔ البتہ فرانس اور جرمنی بظاہر معاشی مدمقابل ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ ان کی فرمیں عالمی مارکیٹ میں امریکی کمپنیوں کا مقابلہ کر رہی ہیں۔ آج یہ ایک عام رائے ہے کہ بین الریاستی (ملٹی نیشنل) سرمایے کی وجہ سے قومی ریاست کا تصور غیر متعلق ہو کے رہ گیا ہے۔ میں یہ ماننے کو تیار نہیں۔ مگر ملٹی نیشنل کمپنیاں موجود ہیں اور ہم بڑی اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان کے اصلی مالک کون اور کہاں ہیں۔ مثال کے طور پر ہیلی برٹن اور بیکٹل (Bechtel) کی جڑ امریکہ میں ہے، ان کے کچھ مدمقابل جرمنی اور فرانس میں ہیں۔ تاہم قومی ریاست، ان نام نہاد ملٹی نیشنل کمپنیز کے مفادات کے تحفظ کے لیے ضروری ہے۔ انہیں بین الریاستی یعنی ملٹی نیشنل کا نام محض استحصال کے لیے دیا گیا ہے۔ لیکن جڑوں کے اعتبار سے یہ کسی نہ کسی قومی ریاست سے جڑی ہوئی ہوتی ہیں۔ اس طرح امریکہ اور کچھ یورپی ممالک کے سامراجی معاشی مفادات کے درمیان رقابت واضح ہے اور یہی عراق میں اختلافات کی بنیاد ہے۔

اگر مستقبل کا جائزہ لیا جائے تو اب امریکہ کی نظریں مشرق بعید میں جزیرہ نما کوریا، جاپان اور چین پر لگی ہوئی ہیں۔ اگر یہ ممالک معاشی، سیاسی اور فوجی اعتبار سے متحد ہو گئے تو نہایت تباہ کن ثابت ہوں گے۔ امریکیوں کو خوف ہے کہ اگر دس سال میں ایسا ہو گیا، یعنی یہ ممالک پوری طرح متحد ہو گئے تو یہ خطہ معاشی طور پر غلبہ حاصل کر لے گا۔

امریکہ کی حکمت عملی اور پالیسی یہ ہے کہ ان ممالک کو ایک دوسرے سے دور رکھا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اب بش انتظامیہ کوریا تک کو دوبارہ متحد ہونے سے روک رہی ہے۔ کیونکہ انہیں خوف ہے کہ متحدہ جزیرہ نمائے کوریا، ایٹمی طاقت بن کر جاپان کو بھی ایٹمی ہتھیار بنانے پر مجبور کر دے گا۔ اس طرح اس خطے میں تین ایٹمی طاقتیں کھڑی ہو جائیں گی یعنی جاپان، کوریا اور چین۔ اگر ایسا ہو گیا تو میرا خیال ہے کہ امریکہ ان ملکوں کو آپس میں لڑا دے گا۔ کیونکہ وہ اس خطے میں کسی بھی قسم کے اتحاد سے نہایت خوفزدہ ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ اتحاد امریکی مفادات کے لیے شدید خطرہ تو ہو گا۔

بلا تکلف عرض کروں تو حقیقت یہ ہے کہ بش کے حامی مضمون نگار جن کے مضامین امریکی پریس میں چھپتے رہتے ہیں، ان محرکات کو چھپا بھی نہیں پاتے۔ اگر آپ عراق جنگ

کے بارے میں تھامس فریڈمین کا مضمون پڑھیں تو یہ سب کچھ نہایت واضح ہو جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ... اگر کوئی یہ ظاہر کرے کہ یہ سب کچھ تیل کے لیے نہیں ہے، تو قہقہہ لگانے کو جی چاہتا ہے۔ واقعی مقصد محض تیل نہیں ہے۔ تو گویا اب وہ اپنے حقیقی عزائم پر پردہ ڈالنے کی کوشش بھی نہیں کر رہے، وہ کہہ رہے ہیں کہ ... "یہ صورتِ حال ہے ہم دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہیں۔ یہاں ہمارے معاشی مفادات کا سوال ہے اور یہ ہمارے حکمت عملی سے متعلق مفادات ہیں۔ او ریہ ہمارے جغرافیائی مفادات ہیں اور ہمیں ان کا دفاع کرنا ہے۔" تو یہ ہے سامراجیت، جو نئی صورت حال میں ماضی کی سامراجیت سے مختلف ہے۔ اور عراق کی جنگ میں وہ ایک نئی اور عریاں سامراجیت پر زور دیں گے اور اس کے لیے ایسا طریقِ کار اختیار کریں گے جو اس سے پہلے نہیں کیا گیا۔

آپ نے جن لوگوں کا ذکر کیا، گیانا کے ممتاز مفکر اور فنکار والٹر راڈنی (Walter Rodney) نے ان کے لیے "مقامی خدمت گار" کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ ان مددگاروں کے بارے میں مزید کچھ بتائیے۔

☐ بیسویں صدی کے دورانیے میں یہ بڑا واضح طرزِ عمل رہا ہے، اور اسے ہم بخوبی جان سکتے ہیں۔ اس صدی کے دوران میں کافی عرصے تک قومیت پرستی کو عروج حاصل رہا۔ اس عرصے میں نوآبادیاتی نظام کے خلاف اور قومی خود مختاری کے حق میں تحریکیں چلتی رہیں جو پرانے سامراج سے ٹکراتی رہیں۔ لیکن پرانے سامراج کے پیچھے سائے میں امریکہ بہادر کھڑا تھا۔ چنانچہ جونہی پرانا سامراج سرنگوں ہوا، نیا سامراج نمودار ہو گیا۔

گزشتہ صدی کے وسطی دورانیے میں کیا ہوا؟ کوریا کی جنگ۔ جو امریکہ تین سال تک اقوام متحدہ کے حوالے سے لڑتا رہا۔ اس میں صنعتی اعتبار سے کوریا کا مستحکم شمالی حصہ تباہ و برباد کر دیا گیا۔ ایک عمارت تک باقی نہ رہنے دی گئی۔ اس کا اندرونی ڈھانچہ (انفراسٹرکچر) مکمل طور پر تباہ کر دیا گیا۔ اس کے بعد طرفین فائر بندی پر رضامند ہوئے۔

بعد ازاں ویت نام کی جنگ شروع ہو گئی۔ پہلے فرانسیسیوں کو ویت نام میں شکست ہوئی تھی۔ امریکہ اس شکست کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھا چنانچہ وہ بھی کود پڑا۔ اور پہلی بار امریکی لیڈروں کو ایٹمی ہتھیار استعمال کرنے کا خیال آیا، سیکرٹری آف سٹیٹ جان فاسٹر ڈلس نے فرانس اور مغربی اتحادیوں کو تجویز پیش کی کہ یہ جو ڈین بین فو، (جہاں ایک بڑی لڑائی میں

فرانسیسیوں کو شکست ہوئیؑ کے آس پاس ''کیڑے مکوڑے'' رینگتے پھرتے ہیں انہیں لگام دینے کے لیے ایٹمی ہتھیار استعمال کرنا ہوں گے۔

ان ''کیڑے مکوڑوں'' سے ڈلس کی مراد ویت نام کے باشندے تھے جنہیں ایٹمی ہتھیاروں سے نیست و نابود کرنا تھا۔

میں نے ان مثالوں سے آغاز اس لیے کیا کہ قومی تحریکوں اور ان کے کردار کو سمجھے بغیر ہم ان معاونین کے کردار کو ٹھیک سے سمجھ نہیں سکتے۔ امریکی سامراج کا مقصد یہ تھا، کہ قوم پرست حکومتوں کو اتار پھینکا جائے اور ان کی جگہ ایسے افراد آگے لائے جائیں جو بظاہر نوآبادیاتی نظام کے خلاف دکھائی دیں مگر اندر سے سامراج کے خادم ہوں۔

انہوں نے اسے کس طرح عملی جامہ پہنایا؟ وہ ویت نام میں تو ناکام رہے، لیکن کوریا کو تقسیم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن وہ جمہوری طریقے سے جنوبی کوریا پر حکومت نہیں کر سکتے تھے کیونکہ وہاں کوئی سامراجی گماشتہ میسر نہیں تھا جو انتخابات میں کامیاب ہو سکے۔ سو جب آپ کو کوئی ایسا خدمت گار نہیں ملتا جو جمہوری طریقے سے منتخب ہو سکے تو آپ فوج کو آگے لاتے ہیں۔ یہی کچھ انہوں نے پاکستان میں کیا۔

اپریل 1959 میں عام انتخابات منعقد ہونے والے تھے۔ ان کے نتیجے میں ایسی حکومت قائم ہو جاتی جو ان دفاعی معاہدوں سے الگ ہو جاتی جن میں امریکہ نے پاکستان کو جکڑ رکھا تھا۔ چنانچہ امریکہ نے ان انتخابات کا ٹنٹا ختم کرنے کے لیے اکتوبر 1958ء میں تختہ الٹائے جانے کا اہتمام کیا اور فوج کو اقتدار میں لے آیا۔

جس ملک نے انہیں گزشتہ صدی کے وسط میں بے حد پریشان کیا، وہ انڈونیشیا تھا۔ کیونکہ وہاں چین اور روس سے باہر دنیا کی سب سے بڑی کیمونسٹ پارٹی موجود تھی۔ اس کے ایک لاکھ ممبر تھے اور دو لاکھ افراد اس کی ملحقہ تنظیموں میں موجود تھے۔ حکومت اور مسلح افواج میں اس کیمونسٹ پارٹی کا اچھا خاصا اثر و رسوخ تھا۔ ایسے میں امریکیوں نے کیا کیا؟ انہوں نے دوسری جنگ عظیم کے بعد کا گھٹیا ترین منصوبہ بنایا اور ایک فوجی انقلاب کے ذریعے سوہارتو کو اقتدار میں لے آئے۔ سوہارتو نے ایک لاکھ افراد قتل کر دیئے اور ملک کی مضبوط ترین سماجی تحریک کا قلع قمع کر دیا۔ خاص طور پر دیہات میں جہاں کیمونسٹوں نے کسانوں کو منظم کر رکھا تھا، ہولناک قتل عام ہوا۔ ایک لاکھ افراد قتل کر دیے گئے اور ٹائم میگزین نے بڑی ڈھٹائی سے لکھا کہ ایک مدت کے بعد مغرب کو ایشیا سے ''اچھی خبر'' ملی ہے۔ عراق میں موجود بدترین

آمریت سے بھی بُرا یہ آمر لاشوں کے بہت بڑے انبار پر اقتدار میں آیا۔ سوہارتو کے روپ میں امریکیوں کو ایسا گماشتہ میسر آ گیا جو بیسویں صدی کے اختتام تک برسراقتدار رہا۔ 1975 میں اس نے مشرقی تیمور پر یلغار کی اور وہاں ہزاروں افراد کو بھون ڈالا۔ اس سے قبل انڈونیشیا میں اس نے خود سیکولر اور انتہا پسند اپوزیشن کو کچل کے رکھ دیا تھا۔ بہت سوں کو حیرت ہے کہ انڈونیشیا میں اسلام پسند اس قدر طاقتور ہیں۔ اصل وجہ یہ ہے کہ 1965 میں اسلام پسندوں کو سوشلسٹوں کے قتل کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔ انہیں کہا گیا تھا: جاؤ اور انہیں مٹا ڈالو۔ یہ دہریے ہیں، کمیونسٹ ہیں، قتل، قتل، قتل۔ تو یہ طریقہ کار تھا اپنے مددگار اور اتحادی وضع کرنے کا۔

ماضی قریب میں، سرد جنگ کے اختتام کے بعد امریکہ اور بین الاقوامی سرمایہ داری کی فتح کے باعث نیم قوت پرست سیاستدانوں کو بھی بے بس کر دیا گیا۔ جو صرف یہ کہتے تھے ... ''اب اور کیا کریں؟ ... بس ان کے ساتھ کام کرو، اور ان کی خدمت کرو'' ... اس کے نتیجے میں پوری تیسری دنیا بے مثال کرپشن کی لپیٹ میں آ گئی ... اور اب یہ کرپشن دوسری اور پہلی دنیا تک پھیل گئی ہے۔ سیاست میں بھی کرپشن کی انتہا ہو گئی۔ یہاں تک کہ اب یہ اجتماعی یا تنظیمی زندگی کا جزو لاینفک بن گئی ہے۔

امریکہ میں بھی یہ صورت حال چلی آ رہی تھی مگر اب یہ رِسنے لگی ہے۔

گزشتہ بیس برسوں کے دوران میں یہ بے حد مشکل رہا ہے، کہ کوئی ایسا فرد منتخب ہوا ہو جو اپنے لوگوں اور اپنی ریاست کے حقوق کے لیے لڑنے پر آمادہ ہو۔

ہم یہ انٹرویو لاطینی امریکہ میں کر رہے ہیں، اور یہ وہ براعظم ہے جو کچھ عرصہ کے لیے باغی رہا۔ ہم وینزویلا میں ہیوگوشاویز (Hugo Chavez) کے انتخابات، چالیس سالہ محاصرے کے بعد فیڈل کاسترو کو گرانے میں ناکامی، اور برازیل ... جہاں یہ انٹرویو ہو رہا ہے ... میں لولا (Lula) کی کامیابی دیکھ چکے ہیں۔ پھر ہم نے ایکواڈور میں لیوسیو گوٹیرز (Lucio Gutierrez) کی فتح بھی دیکھی۔ آپ کو معلوم ہے کہ بولیویا میں ایوو مارلس (Evo Morales) کارپوریشن کے امیدوار کو شکست دینے کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔ چنانچہ ہم ایک نئی لہر کو انگڑائی لیتے ہوئے دیکھ رہے ہیں جسے آپ نیم قوم پرستی یا ابتدائی قوم پرستی کا نام دے سکتے ہیں اور جو مدافعت کرنا چاہتی ہے مگر نہیں جانتی کہ مدافعت کیسے ہو۔ اس مقصد کے لیے اگر ایک زندہ رہنے کی صلاحیت رکھنے والا انداز، نمونہ یا ماڈل وجود میں آ جاتا تو

MashalBooks.com

یہ ادھر ادھر بھی پھیل سکتا تھا لیکن ایشیا اور افریقہ میں کسی نہ کسی طور جھک جانے والی حکومتیں قائم رکھی گئیں۔

یہ سلسلہ ہمیشہ جاری نہیں رہ سکتا۔ اگر چہ یہ انوکھا سا خیال معلوم ہوتا ہے، مگر میرا خیال ہے کہ عراق کی جنگ، عراق پر قبضے اور پھر وہاں صدام کی جگہ امریکی انتظامیہ کی کٹھ پتلی حکومت کا قیام تا کہ جنگ جیتنے کی ٹرافی کے طور پر تیل میں شراکت ممکن ہو، یہ سب ''کارنامے'' جلد یا بدیر سخت مزاحمت کو جنم دے کے رہیں گے۔ اس میں چار سال بھی لگ سکتے ہیں اور دس سال بھی۔ اس بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ تاہم ایسا ہوگا ضرور۔ تو اس لحاظ سے امریکی سامراج دوسری سامراجی طاقتوں سے مختلف نہیں۔ یہ دھیرے دھیرے ایسے بیج بو رہا ہے جن سے مختلف قوتیں پیدا ہوں گی۔

لیکن خود امریکہ سے ہی مخالفت کو پھوٹنا ہے۔ یہ دلچسپ بات ہے کہ گلوبلائزیشن مخالف تحریک نے سیاٹل سے ہی جنم لیا۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ 1898 میں دنیا کی پہلی سامراج مخالف جماعت کی بنیاد شکاگو میں رکھی گئی تھی۔ اور یہ بنیاد امریکیوں پر مشتمل ایک گروہ نے رکھی تھی جن میں مارک ٹوین پیش پیش تھا۔ وہ فلپائن پر امریکی قبضے کے خلاف ردعمل کے طور پر متحرک ہوئے تھے۔ امریکیوں نے فلپائن میں سپین کے ساتھ ایک معاہدہ کیا تھا جو خاصی حد تک ویسا ہی تھا جیسا ویت نام میں فرانس کے ساتھ کیا گیا تھا—— تم فلپائن سے نکل جاؤ۔ پھر جعلی سی لڑائی ہوگی جسے ہم نورا کشتی کہا کرتے ہیں—— اور پھر ہم قبضہ جما لیں گے۔ چنانچہ پھر امریکیوں نے کنٹرول سنبھال لیا اور ان کی زیر نگرانی قوم پرست کچل دیے گئے۔ صرف ایک سال میں شکاگو میں قائم کی گئی سامراج مخالف جماعت (Anti Imperialist League) کے اراکین کی تعداد تیس مختلف شہروں میں چوتھائی ملین کے قریب جا پہنچی۔ اور یہ وہ زمانہ تھا، جب وہاں نہ تو کمیونزم تھا، اور نہ کمیونسٹ۔ لیکن سامراج موجود تھا۔ بہادر اور ذہین امریکی لوگ سامراج کی موجودگی صاف طور پر دیکھ سکتے تھے۔

میں پوری دیانت داری سے سمجھتا ہوں کہ اب وقت آ پہنچا ہے، مارک ٹوین اور سامراج مخالف جماعت کے دیگر حامیوں کے وارث متحد ہو جائیں اور پھر ایک ویسی ہی تنظیم کا ڈول ڈالیں، کیونکہ اب امریکی سامراج کہیں زیادہ خطرناک صورت اختیار کر گیا ہے، اس کی فوجی طاقت کو ٹیکنالوجی میں بے پناہ ترقی کی وجہ سے فی الواقعی چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ یہ یقیناً ایک بہت بڑا قدم ہوگا کہ ایسی تنظیم قائم کی جائے جو اس سامراج کے عین دل میں اس کے خلاف

اخلاقی جدوجہد شروع کرے۔ میری شدید آرزو ہے کہ ایسا ہو۔

انیسویں صدی میں یورپی سامراج کی بنیاد نسلی تعصب پر رکھی گئی تھی اسے تاریکی اور جہالت میں ڈوبے ہوئے لوگوں کو تہذیب آشنا اور مشرف بہ عیسائیت کرنے کا نام دیا گیا۔ یہ تو تب تھا۔ اب کیا ہے؟ سامراجیت میں نسلی تعصب کا کیا کردار ہے؟

□ نسل پرستی پرانے سامراج کی بنیاد تھی۔ تاہم نئے اور پرانے سامراج میں ایک مشابہت ہے۔ جنگوں کی پشت پر ''انسانی ہمدردی'' کا پراپیگنڈہ اور راگ خاصی دلچسپ بات ہے۔ جب وہ بلقان میں داخل ہوئے تو یہی راگ الاپ رہے تھے۔ مجھے یاد آیا کہ جب برطانیہ نے براعظم افریقہ کا بہت بڑا حصہ غصب کر لیا تھا تو وہ بھی ''انسانی ہمدردی'' ہی کا شور مچا رہے تھے۔ برطانویوں نے کہا کہ ہم وہاں غلامی کو نیست و نابود کرنے کے لیے جا رہے ہیں۔ اور یہ وہ ملک کہہ رہا تھا جس نے غلامی سے بہت کچھ کمایا۔ زیادہ تر دولت اور عظیم الشان عمارتیں، جنہیں دور دراز سے لوگ دیکھنے آتے ہیں، غلامی ہی کے بل بوتے پر معرض وجود میں آئیں۔ اٹھارویں صدی کے ابتدائی سالوں میں برطانوی اشرافیہ اور حکمران طبقے کی معاشی، سماجی اور ثقافتی تشکیل میں غلاموں کی تجارت نے بہت بڑا کردار ادا کیا۔ موجودہ دور میں جو ''انسانی ہمدردی'' کی پکار بلند کی جا رہی ہے تو اس سے وہی دور اور انداز یاد آتے ہیں۔ تاہم نسل پرستی کا محرک کمزور پڑ گیا ہے۔ اب اسے پہلے کی طرح استعمال میں نہیں لایا جاتا۔ دراصل وہ پسماندہ لوگوں کو اس کے استعمال کے بغیر ہی سرنگوں کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ بڑی دھماکہ خیز صورت ہو گی۔

بہرحال آپ اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ کہیں نیچے ''گوروں کا احساسِ برتری'' موجود ہے۔ میں آپ کو ایک ٹھوس مثال دیتا ہوں۔ ذرا 11 ستمبر کے سانحے کو یاد کیجئے جب نیو یارک اور واشنگٹن میں کثیر تعداد میں شہری لقمہ اجل بنے۔ ساری دنیا کو سرعام رونے رلانے پر آمادہ کیا گیا یا کم از کم میڈیا کا عمومی سٹائل تو یہی تھا۔ آخر ایسا کیوں؟ کیونکہ وہ امریکہ کے شہری تھے۔ جب بلا امتیاز بمباری میں افغانستان کے شہری مرتے ہیں، وہ بمباری جسے اتفاقیہ بمباری کہتے ہیں—— ایک بارات کو بمباری کا نشانہ بنا دیا گیا اور وجہ یہ بتائی گئی کہ خوشیاں مناتے باراتیوں نے (حسب رواج) کچھ فائر داغ دیے۔ امریکی فوجیوں نے سوچا، ''ہم پر حملہ ہو گیا ہے، آگے بڑھو اور ان ذلیلوں کا بموں سے بھرکس نکال دو۔'' اس کے علاوہ وہ

اموات جواب قحط کے باعث ہو رہی ہیں۔ ان اموات کو کوئی خاطر میں نہیں لاتا۔ وہ بے گناہ افغان شہری جو بمباری سے مارے گئے ان کی تو کوئی کبھی یادگار بھی نہیں بنائے گا۔ میں نے تب بھی کہا تھا کہ یہ محض انتقام کی ظالمانہ جنگ ہے۔

آخر افغانوں کی جانیں اتنی بے قدر و قیمت کیوں ہیں؟ اس لیے کہ اس ساری کارروائی کے پس منظر میں ان کا یہ احساس کارفرما ہے کہ ہم ایک برتر قوم ہیں، ایک اعلیٰ نسل ہیں، اور اعلیٰ لوگ ہیں۔

عراقی ہلاکتوں پر گفتگو کے دوران میں ان کا متکبرانہ انداز ملاحظہ فرمائیں۔ سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ اور اس کے عراقی حلیفوں نے ایک کانفرنس کا اہتمام کیا۔ میرا ایک دوست بھی اس میں شریک ہوا، حالانکہ اسے دعوت نہیں دی گئی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ ''جس بات نے مجھے شدید رنج پہنچایا وہ ان کا انداز تھا۔ جب وہ عراقیوں کی ہلاکتوں کا ذکر کرتے تھے، وہ نہایت تکبر سے کہتے، ہاں تو کتنے شہریوں کی ہلاکت قابل قبول ہوگی۔'' میرے دوست نے بتایا کہ امریکیوں اور ان کے عراقی دوستوں کے درمیان جس تعداد کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی وہ دو لاکھ پچاس ہزار تھی۔ وہ کہہ رہے تھے، ٹھیک ہے اس سے آگے نہیں بڑھنی چاہیے۔ کیا چوتھائی ملین عراقیوں کی ہلاکتیں قابل قبول ہیں؟ امریکہ میں تین ہزار اموات قبول نہیں، لیکن عراق میں اڑھائی لاکھ افراد کی ہلاکت قابل قبول ہے۔ کیا یہ انتہائی لغو اور مضحکہ خیز بات نہیں؟ کیا غریب عربوں کی جانیں اتنی بے قدر و قیمت ہیں کہ ان کی ہلاکتوں کی مذمت بھی نہ کی جا سکے۔ نسلی تعصب نے پرانے سامراج کی نسبت مختلف شکل وصورت اختیار کر لی ہے، لیکن وہ اب بھی موجود ہے۔

> 1996ء میں اس وقت اقوام متحدہ میں امریکہ کی سفیر میڈلین البرائٹ سے عراق پر پابندیوں، خاص طور پر 5,00,000 بچوں کی ہلاکت کے اثرات کے بارے میں پوچھا گیا اور اس سے سوال کیا گیا کہ ''کیا یہ ہلاکت صحیح ہے؟'' اس نے جواب دیا، ''میں سمجھتی ہوں ٹھیک ہے۔''

□ یہ دوسری جنگ عظیم کے بعد کسی اہم امریکی لیڈر یا سیاستدان کا تکلیف دہ ترین بیان ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ یہ بیان امریکہ میں کسی قسم کی ہنگامہ آرائی کا باعث نہ بنا۔ اگر 1968ء میں لنڈن بی جانسن یا 1970ء میں رچرڈ نکسن نے یہ بیان دیا ہوتا کہ ... ''ہیں

لاکھ ویت نامیوں کی ہلاکت مناسب قیمت ہے''... تو میرا خیال ہے امریکہ میں وہ طوفان اٹھتا کہ خدا کی پناہ۔لوگ چیختے چلاتے ہوئے کہتے کہ ''اپنے الفاظ واپس لو۔'' وائٹ ہاؤس کو تہس نہس کرنے کے لیے دوڑ پڑتے۔ درحقیقت میڈلین البرائٹ نے یہ الفاظ CBS پر لیزلی سٹال (Lesley Stahl) سے کہے تھے۔اور نہایت دکھ دینے والی بات یہ ہے کہ کلنٹن نے اس کی کوئی سرزنش نہ کی۔ سرکاری طور پر یہ کہا گیا کہ ... ''ان اموات کا ذمہ دار صدام ہے۔'' لیکن آپ اسے لحہ بھر کے لیے چھوڑ دیجئے۔سوال یہ نہیں کہ البرائٹ سے کیا پوچھا گیا۔سٹال نے البرائٹ کو متوجہ کیا کہ عراق پر پابندیوں کی قیمت 5,00,000 بچوں کی اموات ہے تو البرائٹ نے کہا کہ یہ قیمت کچھ زیادہ نہیں ہے۔اب کوئی ایسے سیاستدان سے کیا کہے جو انسانی جان کو اس قدر حقیر سمجھتا ہو۔ میں جانتا ہوں کہ لوگ ایسے الفاظ سے نفرت کرتے ہیں مگر تیس کی دہائی میں تھرڈ رائخ بھی یہی راگ الاپا کرتا تھا، کہ بہت سے لوگوں کی ہلاکت مہنگا سودا نہیں، بڑی قیمت نہیں۔ وہ ہمیں پسند نہیں کرتے۔ وہ مختلف لوگ ہیں اور ان کی زندگیاں ہمارا مسئلہ نہیں ہیں۔آج بھی ہم اس قسم کا راگ سن رہے ہیں جس میں ہلاکت کا شکار ہونے والوں پر الٹا الزام لگانے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ وہ موت کے منہ کے آگے آئے کیوں؟ یہ بات دل دہلا دینے والی ہے۔CBS نے پانچ لاکھ کی تعداد ہوا میں سے کشید نہیں کر لی۔ یہ اقوام متحدہ کی جانب سے دی گئی سرکاری تعداد ہے۔اور عراق میں متعین اقدام متحدہ والوں نے فراہم کی۔

عراق میں پابندیوں کے نتیجے میں ہونے والی نسل کشی کے مکروہ فعل نے اقوام متحدہ کے دو سینئر افسروں، ڈینس ہالیڈے اور ہنز وان سپانک کو استعفیٰ دینے پر مجبور کر دیا۔ انہوں نے کیوں استعفیٰ دیا؟ اس لیے کہ وہ نفیس اور آزاد خیال انسان تھے جو ''اقوام متحدہ'' کے نام پر عراق کے لوگوں کے ساتھ ہونے والے سلوک کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اگر دنیا میں انصاف ہوتا تو البرائٹ، کلنٹن، بلیئر اور ان پابندیوں کے ذمہ دار دوسرے سیاستدانوں پر کسی فوجداری عدالت میں مقدمہ چل رہا ہوتا۔ بہرحال یہ پابندیاں وہاں حکومت کو کمزور کرنے میں ناکام ہوگئیں۔عراق کے لوگوں کے ساتھ جو ناروا سلوک کیا گیا، اس نے الٹا انہیں حکومت کا مزید محتاج بنا دیا۔عراق کو اس حق سے بھی محروم کر دیا گیا کہ وہ پانی صاف کرنے اور سیوریج کے نظام کی مرمت کے لیے بنیادی آلات بھی درآمد کر سکے۔

اور یہ ہے وہ مقام جہاں سامراج اپنی بدترین شکل میں سامنے آتا ہے اور یہاں تو وہ خاص طور پر اپنی بدترین صورت میں ظاہر ہوا۔ ہندوستان میں برطانوی سامراج کی بربریت

کے سلسلے میں جلیانوالہ باغ کا سانحہ آپ کو یاد ہو گا جہاں ایک دوپہر سینکڑوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اور کبھی دانستہ طور پر قحط پیدا کر دیا گیا جس کے نتیجے میں ہزاروں غریب کسان دم توڑ گئے۔ اس سانحے پر تو آنجہانی ستیہ جیت رائے نے فلم بھی بنائی تھی۔ اس پر ساری دنیا میں احتجاج ہوا۔ پھر جب بیلجیئم کے لیوپولڈ نے کانگو کے بے گناہ باشندوں کا قتل عام شروع کیا تو پھر دنیا میں احتجاج کی لہر دوڑ گئی۔ آرتھر کونن ڈائل نے اس پر ''کانگو کا جرم'' کے عنوان سے کتاب لکھی جس کے دو لاکھ نسخے دو مہینوں میں فروخت ہو گئے۔ اس قتل عام کے خلاف عالمگیر تحریک چلی۔ اب یوں لگتا ہے جیسے دنیا نیند کے عالم میں ہے، یورپ اور شمالی امریکہ میں لوگوں کو اتنا آرام اور سہولتیں میسر آ گئی ہیں کہ عام شہریوں کی ہلاکت ان کا مسئلہ ہی نہیں رہا ـــــ وہ ایک خدمت بجا لا رہے ہیں۔ ایک مقصد پورا کر رہے ہیں ـــــ اور میں آپ کو بتاتا ہوں کہ کون سا مقصد پورا کر رہے ہیں، وہی جو امریکی سامراج کا مقصد ہے۔

عوامی رائے عامہ کی تشکیل میں میڈیا کا کیا کردار ہے؟ مثال کے طور پر امریکی میڈیا مسلسل کہتا رہا ہے کہ صدام حسین امریکہ کے لیے ایک خطرہ ہے، کیا آپ امریکی اور یورپی میڈیا کا تقابلی جائزہ لیں گے؟

□ ان میں واقعی ایک فرق ہے۔ امریکہ میں جو بات فی الواقعی مجھے ہکا بکا کر دیتی ہے وہ یہ ہے کہ امریکی ٹیلی ویژن باقی دنیا کو بہت ہی کم کوریج دیتا ہے، نہ ہونے کے برابر۔ یوں لگتا ہے جیسے ان کے نزدیک لوگوں کو جغرافیہ سکھانے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ وہاں جاؤ اور بمباری شروع کر دو ـــــ یعنی آپ نہیں جانتے کہ افغانستان کہاں واقع ہے ... دیکھو یہ یہاں واقع ہے۔ یہ، جہاں ہم بمباری کر رہے ہیں، افغانستان ہے۔ آپ کو معلوم نہیں کہ عراق کہاں پر ہے ـــــ یہ یہاں ہے۔ دیکھو ہم جہاں بم برسانے والے ہیں، یہاں عراق ہے۔ آپ کے پاس جو آبادی ہے اسے میڈیا کے ذریعے صرف جنگ کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ اس طرزِ کار کو انتہائی غلیظ قسم کے پراپیگنڈے کا نام دیا جا سکتا ہے۔ آپ لوگوں کو خود سے سوچنے سمجھنے کا موقع نہیں دیتے۔ آپ انہیں خوفزدہ کیے رکھتے ہیں۔

یہ تصور کہ صدام حسین امریکہ کے لیے خطرہ ہے، بے چارے یورپ والوں کو ہنسنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ حتیٰ کہ یورپی سیاستدان جو روزانہ امریکی لیڈروں سے گپ شپ کرتے ہیں، اپنی ہنسی پر قابو نہیں پا سکتے۔ حال ہی میں میں نے برلن کے ایک بہت بڑے تھیٹر میں ایک

مباحثے میں حصہ لیا۔ وہاں ایک دو ہزار سامعین موجود تھے۔ میں رتھ وتج وڈ سے بحث کر رہا تھا، جو رمز فیلڈ کی جز وقتی مشیر ہے۔ میں حیران رہ گیا جب وہ اچانک جرمنوں کی طرف مڑی اور کہنے لگی ''مجھے علم ہے کہ آپ کیوں اس جنگ کی مخالفت کر رہے ہیں۔ اس لیے کہ آپ لوگ صدام سے خوفزدہ ہیں۔'' بعد میں لوگوں نے مجھ سے کہا ''ہم اس کی یہ بات سن کر واقعی ہکا بکا رہ گئے۔ کیا مطلب ہے اس کا؟'' میں نے کہا ''یہ وہی بات ہے جو امریکہ میں وہ ہر وقت کرتے رہتے ہیں۔ وہ یہ کہہ کر لوگوں کو قائل کرتے ہیں کہ صدام حسین واقعی ایک بڑا خطرہ ہے۔ اور یوں لوگوں کو ڈراتے رہتے ہیں اور میں بوکھلا گیا کہ اب وہ اپنے ہی پراپیگنڈے پر یقین بھی کرنے لگے ہیں۔'' سامعین میں سے ایک نے مجھے کہا ''یہ ہمارے لیے سیاسی سے زیادہ بشریاتی تجربہ تھا۔ کیا یہ امریکہ کی کوئی اہم شخصیت تھی؟'' اور یہاں آپ ایک بڑے فرق کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

امریکہ میں میڈیا زوال پذیر ہے۔ مجھے یاد ہے ویت نام کی جنگ میں صحافی خاصے سخت سوال پوچھا کرتے تھے۔ ''یہ سب کیا مصیبت ہے؟ ہمارے لڑکے لڑکیاں کیوں عذاب جھیل رہے ہیں؟'' اب وہ سب کچھ ختم ہو گیا۔ اب امریکہ میں کوئی ٹیلی ویژن جنگ کے بارے میں شاید ہی سوال اٹھاتا ہو۔ یورپ کے اکثر ٹیلی ویژنوں کا طرزِ عمل بھی یہی ہے۔ یہ بات ان پر بھی صادق آتی ہے۔ البتہ امریکہ اور یورپ کے پرنٹ میڈیا میں خاصا فرق ہے۔ آپ نیویارک ٹائمز کو دیکھ لیجئے، یہ اعلیٰ حکام پر کوئی تنقیدی کالم نہیں چھپنے دیتا۔ مجموعی طور پر اس کی رپورٹنگ کا انداز، اس کی تجاویز اور اس کے صفحات پر چھپنے والی سطور سے اسٹیبلشمنٹ کا ہم قدم دکھائی دیتا ہے۔ مجھے کبھی کبھی مزاح اچھا لگتا ہے، اور آپ اسے میرا مزاحیہ جملہ ہی سمجھئے کہ آج کل ''ٹائم'' امریکہ کا ''پراودا'' ہے۔ تھامس فریڈمین، جب اپنے منبر پر کھڑا ہوتا ہے، تو سامراجی انداز میں بولتا ہے۔ کہتا ہے کہ ہم یہ ہیں۔ آپ کو اعتراض ہے تو پھر ذرا ہوشیار رہیے، میں آگاہ کیے دیتا ہوں۔

ایک اور بڑی دلچسپ بات ہے کہ یہ نام نہاد صحافی دنیا بھر میں سفر کرتے رہتے ہیں۔ لیکن بعض اوقات انتہائی اہم جدوجہد انہیں نظر تک نہیں آتی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی نگاہیں صرف ان معاملات پر مرتکز ہوتی ہیں جو انہیں اپنے اخبارات میں رپورٹ کرنا ہوتے ہیں ـــــ مثال کے طور پر فلسطین پر اسرائیل کے تسلط کے بارے میں امریکی میڈیا کا رویہ دیکھئے۔ امریکی میڈیا ایسا منظر نامہ پیش کرتا ہے کہ یوں لگتا ہے فلسطین اسرائیلی سرزمین پر

قابض ہے۔ چنانچہ بے چارہ اسرائیل، بے پناہ طاقتور فلسطین کے خلاف محض مزاحمت کر رہا ہے۔ یہ صورت حال مجھے شدید کوفت اور مایوسی میں مبتلا کر دیتی ہے، کیونکہ جو کچھ دکھایا جا رہا ہے یہ حقائق کے قطعی برعکس ہے۔

یورپ میں صورت حال قدرے مختلف ہے۔ یہاں ابھی تک ایسے اخبارات موجود ہیں جو تنقیدی مضامین چھاپ دیتے ہیں۔ برطانیہ، فرانس اور اٹلی کے اخبارات میں عراق اور فلسطین کے حوالے سے تنقید شائع ہوئی مگر امریکہ میں کبھی ایسا نہیں ہوا —— ہاں لاس اینجلس ٹائمز کو استثنیٰ حاصل ہے کہ وہ بعض اوقات خاصا تنقیدی مواد شائع کر دیتا ہے۔

دی نیشن، ان دیز ٹائمز، دی پروگریسو Z جیسے جرائد کے علاوہ نئی ویب سائٹس جیسے indymedia.org یا commondreams.org یا zmag.org وغیرہ متبادل معلومات فراہم کر رہی ہیں۔

☐ متبادل معلومات کے یہ نیٹ ورکس سیٹلائٹ سے پھوٹنے والی موجوں کے ساتھ ساتھ ہر طرف پھیلتے چلے گئے ہیں اور یہ میڈیا کی اہمیت کو چیلنج کرنے والی اہم پیش قدمی ہے۔ بڑی عظیم پیش قدمی۔ اس کا مطلب ہے کہ دنیا بھر سے سیاسی طور پر باخبر شہری ان ذرائع تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ ایک حیران کن بات ہے اور میں اسے کم اہمیت نہیں دینا چاہتا۔ اس نے کبھی کبھی مجھ جیسے لوگوں کو جنہیں دنیا بھر سے ای میل آتے ہیں، دردِ سر میں مبتلا کیا ہے۔ آپ نے گزشتہ سال ''دی پروگریسو'' کے لیے جو میرا انٹرویو کیا تھا، وہ تقریباً ہر ویب پر نقل کیا گیا۔ چنانچہ مجھے تقریباً ساٹھ مختلف ملکوں سے اس کے بارے میں سوال کیے گئے اور یہ ایک اچھی بات ہے۔

لیکن یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ یوں ان طاقتوں کا مقابلہ ہو سکے گا۔ یہ ایک سنگین غلطی ہوگی۔ ہم اس غرے میں پڑ جائیں کہ ''آہا... ہم نے سب سے پہلے بھانڈا پھوڑ دیا'' —— یہ سچ بھی ہو سکتا ہے۔ انٹرنیٹ سے ہر کوئی تو رجوع نہیں کرے گا۔ اور ہم میڈیا کے مرکزی دھارے یعنی ٹیلی ویژن کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ جنیوا میں اطالوی پولیس متبادل معلومات مرکز میں گھس گئی اور وہاں خوب لاٹھیاں برسائیں۔ انہیں ڈرایا دھمکایا گیا کیونکہ وہاں سرگرم کارکنوں نے ٹیلی ویژن کے کیمرے حاصل کر لیے تھے۔ جب ایک احتجاجی کارلو جیولیانی (Guliani) کو قتل کیا گیا تو انہوں نے ٹیلی ویژن کی فلمیں بنا لی تھیں۔ تاہم ابھی تک یہ

متبادل معلوماتی ذرائع خاصے اہم ہیں۔ کیونکہ یہ حکام کی مکمل اجارہ داری میں بہرحال شگاف ڈالتے رہتے ہیں۔

حیرت ہوتی ہے کہ آخر ایسا کب تک چلے گا! کیا وہ اپنی مخالفت اور ناموافقت کو لگام دینے کے لیے انٹرنیٹ پر پابندیاں نہیں لگائیں گے؟ ہم جانتے ہیں کہ وہ کسی بھی ویب سائٹ یا ای میل میں مداخلت کر سکتے ہیں اور کر بھی رہے ہیں۔ جلد یا بدیر وہ یہاں بھی من مرضی کرنا شروع کر دیں گے۔ سو ہمیں اس کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

بعض ممالک میں ترقی پسند اخبارات موجود ہیں، جنھوں نے کسی نہ کسی طرح چلتے رہنے کا انتظام کر رکھا ہے۔ یہ بات قابل توجہ ہے۔ مثال کے طور پر ناروے میں Class Sturggle ہے۔ اٹلی میں Manifesto II ہے۔ جب آپ 'مینی فیسٹو' کے ایڈیٹر سے بات کرتے ہیں تو وہ کہتے ہیں ''بحران کے دور میں ہماری سرکولیشن شوٹ کر چکی ہے۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب لوگوں کو متبادل ذرائع کی ضرورت ہوتی ہے۔'' میرا خیال ہے کہ ان اخبارات اور ویب سائٹس کا ملاپ مؤثر ہو سکتا ہے۔ لیکن ابھی تک یہ سب سمندر میں ایک قطرے کے برابر ہے ہاں، پھر 'الجزیرہ' ہے جو جنگ کے خطے سے مؤثر طور پر دوسرا رخ بھی دکھاتا ہے۔ چنانچہ امریکہ نے کابل میں ان کے دفتر پر بمباری کر دی تھی۔

اس پروگریسو ریویو میں آپ نے ٹونی بلیئر کا مختصر سا تذکرہ کیا، اس کے بارے میں مزید کچھ کہیے۔

□ ٹونی بلیئر کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ واقعی دہشت گردی کے خلاف جنگ پر یقین رکھتا ہے۔ وہ دلی طور پر ایک قدامت پسند آدمی ہے اور مجھے اس بارے میں ذرا شبہ نہیں ہے کہ وہ کنزرویٹو پارٹی کا اچھا لیڈر ہو سکتا تھا۔ وہ شاید کچھ قدامت پسندوں کے لیے بھی خاصا دائیں بازو کا ہے۔ جہاں تک بلیئر کی سیاست کا تعلق ہے اور جس پر شاذ ہی لوگ گفتگو کرتے ہیں تو اس کی تہہ میں عیسائی بنیاد پرستی موجود ہے اور بہت گہرائی میں موجود ہے۔ ولیم گلیڈ سٹون کے بعد سے اب تک وہ سب سے زیادہ مذہبی لیڈر ہے۔ اس نے اپنے اردگرد جعلی عیسائی مافیا کا حلقہ بنا رکھا ہے۔ جو اپنے سماجی رویے اور عقائد کے اعتبار سے خاصا خودسر ہے۔ بی بی سی کا نیا ڈائریکٹر جنرل مارک تھامپسن بھی اس طریق کار کا حصہ ہے۔

میرا خیال ہے کہ بلیئر نے وزارتِ عظمیٰ کا قلم دان سنبھالتے ہی طے کر لیا تھا کہ وہ ان

MashalBooks.com

معاہدوں پر عمل درآمد جاری رکھے گا جو تھیچر نے ریگن سے کیے تھے۔ خاص طور پر مال وی نس (Malvinas) (فاک لینڈ) کے جھگڑے کے بعد ان معاہدوں نے برطانوی وزارت دفاع کو مکمل طور پر پینٹا گون سے وابستہ کر دیا ہے۔ چنانچہ لازم ہے کہ جب پینٹا گون اپنے اسلحے اور ٹیکنالوجی کو ترقی دیتی ہے تو ضرورت نہ ہوتے ہوئے بھی برطانیہ کو بھی اپنے ہتھیاروں کو ترقی دینا پڑے گی کیونکہ وہ اسی نظام کا حصہ ہے۔ اب برطانیہ کی سیاسی اشرافیہ، وہ کنزرویٹو ہوں یا لیبر، ان معاہدوں کے مکمل طور پر پابند ہیں۔ جب چارلس ڈی گال نے یورپ کی مشترکہ منڈی میں برطانیہ کے داخلے کی تجویز کو ویٹو کر دیا تھا کہ برطانیہ یورپی یونین میں ہمیشہ امریکہ کے کاٹھ کے گھوڑے کا کردار ادا کیا کرے گا ڈی گال کس قدر صحیح تھا۔ بلیئر اہل یورپ کو یہ بتانے کی کوشش کرتا ہے کہ ''میں بش کے قریب ہوں۔ میں اس پر اثرانداز ہوسکتا ہوں۔'' اور ادھر وہ بش سے کہتا ہے ''میں اہم ہوں کہ میں یورپی یونین میں ہوں اور ضمانت دیتا ہوں کہ وہاں تمہارے نظریات کا مکمل دفاع کیا جا رہا ہے۔'' تو بلیئر یہ کردار ادا کر رہا ہے۔ تاہم اب وہ پینٹا گون کے کاٹھ کے خچر سے قدرے آگے دکھائی دے رہا ہے۔

جہاں تک بلیئر کی جانب سے امریکہ کی جی حضوری کا تعلق ہے تو اس کی وجہ برطانیہ کے متعلق اس کا اپنا نظریہ ہے کہ یہ اوسط درجے کا ملک ہے اور اب ایک سامراجی طاقت نہیں یا اس ملک میں ایک استحصالی اور ناکارہ نظام قائم ہے۔ یہ غیر ملکی سرمایے کے لیے پُرکشش ہے کیونکہ یہاں معاوضہ اور ٹیکس کم ہیں۔ یہ تھیچر کی کامیابی تھی۔ بلیئر کا عقیدہ ہے کہ اسے جاری رہنا چاہیے۔ کیونکہ اس کے پاس دوسرا کوئی تصور یا بصیرت موجود ہی نہیں اور اسے جاری رکھنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ کچھ بھی ہو، امریکہ کے ساتھ چمٹے رہو۔ واشنگٹن کی نظروں میں وفادار اتحادی بنے رہو اور اس کے ساتھ مل کر آگے بڑھتے رہو۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ رومن سامراج کے دور میں بھی ایسے چھوٹے حاکم یا صوبیدار ہوا کرتے تھے جو سلطنت میں موجود امورِ واقعی سے آگاہ دیگر عمالوں کے مقابلے میں خود کو زیادہ وفادار ثابت کرنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ بلیئر نے بھی ارادتاً وہی کچھ کرنے کا فیصلہ کیا... امریکی سامراج کا ویسا ہی وفاشعار صوبیدار بننے کا فیصلہ!

مجھے آپ کو یہ بھی بتانا ہے... کیونکہ ایسا نہ کرنا جانب دارانہ بات ہوگی... کہ برطانیہ کے بہت سے لوگ اس کے اس کردار سے نفرت کرتے ہیں۔ خود برطانوی انتظامیہ کے کچھ لوگ امریکہ کی اس چاپلوسی کو ذلت آمیز، بے ہودہ اور گھٹیا حرکت تصور کرتے ہیں۔ فوجی اور

سول سروس میں بہت سے لوگ عراق کی جنگ کے بارے میں بے چینی اور مخاصمت کے جذبات رکھتے ہیں۔ برطانیہ میں پہلی بار رائے عامہ کی اکثریت جنگ کے خلاف نظر آتی ہے۔ چنانچہ بلیئر نے واقعی اپنے مستقبل کو داؤ پر لگا دیا ہے۔

میں نے بلیئر کی عیسائیت اور اس کے عقائد کا ذکر کیا ہے۔ اس کا ایک عقیدہ یہ ہے کہ وہ امریکہ سے چمٹا رہے۔ اس کی شخصیت کا ایک اور نمایاں پہلو یہ ہے کہ وہ خود اچھا خاصا لالچی آدمی ہے۔ اس پر دولت کی ہوس سوار ہے۔ وہ نجی ضیافتوں میں لوگوں کو بتاتا رہا ہے کہ صاحبو وزیراعظم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آپ اتنی دولت نہیں کما رہے جتنی آپ کو کمانی چاہیے۔ کیسے بھلا؟ ایسے۔ اگر ان میں پارسائی کی ظاہرداری اور لالچ دونوں موجودہ ہیں اور وہ جنگ کا جواز بھی پیش کرتے ہیں تو ان کا باطن لازماً بگڑے گا۔ وہ حال ہی میں منتشر سا دکھائی دیا ہے۔ آپ اسے غور سے دیکھیں صاف نظر آتا ہے کہ وہ دباؤ میں اور پریشانی میں ہے۔ سو عراق کی جنگ کا ایک تو اچھا نتیجہ نکلا کہ بلیئر کا سیاسی مستقبل اختتام پذیر ہو جائے گا۔ ہوسکتا ہے یہ میری آرزومندانہ سوچ ہو۔ لیکن اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ اب وہ زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکے گا۔ یہ ایک عجیب صورت ہے۔ کیا وہ غیر مقبول ہے، ناقابل تذکرہ ہے؟ لیکن لگتا ہے کہ کوئی اسے ہاتھ نہیں لگا سکتا۔

> سوویت یونین کے سقوط کے بعد امریکہ بڑی شدت سے ایک مخالف طاقت کی تلاش میں ہے جو سوویت یونین کی جگہ لے سکے۔ انہوں نے پانامہ میں نوریگا کو، لیبیا میں قذافی کو اور وسیع پیمانے پر منشیات کا دھندا کرنے والے کالی (Kali) اور میڈیلین کو آزمایا۔ اب اس نے اسلام کی طرف رخ کر لیا ہے اور کچھ مخصوص بنیاد پرست اور دہشت پسند گروہوں کو اپنا جانی دشمن قرار دیا ہے۔

□ یقیناً انہوں نے یہی کیا ہے۔ ایک بات جس پر امریکہ اور بہت سے دیگر ممالک متفق ہیں یہ ہے کہ اسلامی دہشت گردی بری چیز ہے۔ اور یہ ایک ایسا دشمن ہے جسے تباہ و برباد کر دینا چاہیے۔ لیکن یہاں سے آپ کہاں کا رخ کرتے ہیں؟ کیونکہ جب تک آپ وہ اسرار نہیں جانتے جو نوجوان لوگوں کو اپنی جان قربان کرنے پر آمادہ کرتا ہے آپ انہیں باز نہیں رکھ سکتے۔ سو یہ ایسے ہی چلتا رہے گا۔ ایک غیر مختتم جنگ کے جواز کے لیے انہوں نے یہ دشمن ''تراش'' لیا ہے جیسا کہ ... میں اس کی بار بار وضاحت سے تنگ آ گیا ہوں ... انہوں نے سرد جنگ کے

عروج کے زمانے میں از خود وضع کیے تھے تاکہ انڈونیشیا، افغانستان اور عرب دنیا ان کی ضرورتوں اور مفادات کے سلسلے میں بجا لاسکیں۔ امریکہ اب جن لوگوں کو اپنا دشمن بتا رہا ہے، ان کی بھرپور مدد کرتا رہا ہے تاکہ انتہا پسند قوم پرست حکومتوں کو برباد کرسکے جو سوویت یونین کی حامی اور امریکی مفادات کے لیے خطرناک رہی ہیں۔ اب یہ مذہبی انتہا پسند لوگ ڈھیلے پڑ گئے ہیں کیونکہ امریکہ نے انہیں چھوڑ دیا ہے۔ امریکیوں نے کہا ''اب ہمیں تمہاری ضرورت نہیں۔'' اس پر ان اسلام پسندوں نے کہا، ''تمہیں ہماری ضرورت نہیں، مگر ہمیں یقین ہے کہ ہمیں کردار ادا کرنا ہے۔'' یہ سوچنا حماقت ہے کہ اسلامی ریاستوں میں یکسانیت یا یک رخی فضا قائم ہے۔ یہ بھی دنیا کے دوسرے حصوں کی طرح منقسم ہیں۔ آپ انڈونیشیا کو لیجئے جو سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ وہاں کمیونسٹ ریاستوں سے باہر دنیا کی سب سے بڑی کمیونسٹ پارٹی بھی موجود تھی۔ اس سے لوگوں کو دھچکا لگتا ہے اور وہ پوچھتے کہ ''آخر یہ کیونکر ہوا؟''——

لیکن بیسویں صدی میں دنیا کے ہر حصے میں ایسا ہوا۔ ایسا مخالفانہ لہروں اور روؤں کی بربادی ہی کا نتیجہ ہے کہ امریکہ جیسا عفریت وجود میں آ گیا جو اب انہیں اپنا بہت بڑا دشمن بتا رہا ہے۔ القاعدہ میں کتنے لوگ ہوں گے؟ ان کے زیادہ سے زیادہ دو ہزار ارکان ہیں یا ہوسکتا ہے چار ہزار ہوں۔ کوئی شخص حتمی دعویٰ نہیں کرسکتا کہ یورپ اور امریکہ سمیت دنیا کے مختلف حصوں میں اتنے ارکان مقیم ہیں۔ یہ تباہ کیوں نہ کیے جا سکے۔ یہ عین ممکن ہے، لیکن مسئلہ القاعدہ نہیں ہے۔ مسئلہ وہ صورت حال ہے جو نوجوانوں کو مایوسی کی طرف دھکیل رہی ہے۔ یہ آسانی سے واپسی اختیار نہیں کریں گے۔ اور یہ سلسلہ اس وقت تک ختم نہیں ہوسکتا جب تک خلیج کا مرکزی مسئلہ یعنی فلسطین کا مسئلہ حل نہیں ہوتا، اور جو کچھ عراق میں ہو رہا ہے، اسے ختم نہیں کیا جاتا۔

چنانچہ ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہم عراق کی جنگ کو، دہشت گردی کے خلاف نہیں بلکہ دہشت گردی کو فروغ دینے والی جنگ کہہ سکتے ہیں کیونکہ اب عرب دنیا میں یہ احساس پیدا ہو گا کہ یہ سب کچھ ہماری حکومتوں کے ساتھ مل کر ہو رہا ہے۔ بغداد، اسلامی تہذیب کا گہوارہ قدیم تاریخی، خلفا کا اور الف لیلیٰ کا شہر بغداد، ایک بار پھر صلیبیوں کے قبضے میں ہے۔ اس پر کیا ردِعمل ہوگا؟ عرب دنیا اسے تیل کے لیے صلیبی جنگ سمجھنے لگی ہے۔ اور یہ جو انہوں نے اب اسلام کو ایک بڑا دشمن بنا لیا ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ تیل کے ذخائر مسلمان ملکوں کے پاس ہیں۔ جنوب مشرقی ایشیا میں واقع مسلمان ملک برونائی میں تیل موجود ہے۔ عراق میں دنیا کے دوسرے بڑے تیل کے ذخائر ہیں۔ ایران میں تیل ہے، جزیرہ نمائے عرب میں تیل

ہے، اگر اسلامی ممالک کی زمین کے نیچے تیل نہ ہوتا، مغرب کہہ رہا ہوتا ''یہ ٹھیک سے عیسائی نہیں ہیں۔ انہوں نے طریقے سے عیسائیت کی تعلیم ہی حاصل نہیں کی تو...'' یا کچھ اور چلا رہا ہوتا۔ میرا خیال ہے کہ آج یہ جو اسلام کو دشمن قرار دیا گیا ہے اس کے اسباب تیل سے جڑے ہوئے ہیں۔ یہ مغرب کی ضرورت ہے، لہٰذا اس کا منصوبہ ہے کہ ہمیشہ کے لیے اس علاقے کو اپنے کنٹرول میں رکھے۔

برنارڈ لیوس کو اسلام اور مسلم فکر پر سند کا مقام حاصل ہے۔ اس نے 1990ء میں ماہنامہ اٹلانٹک (Atlantic Monthly) کے لیے ایک مشہور مضمون ''مسلم غیظ وغضب کی جڑیں'' (The Roots of Muslim Rage) کے نام سے ایک مضمون لکھا اور ''تہذیبوں کا تصادم'' کی اصطلاح استعمال کی، وہاں سے بعد میں یہ اصطلاح ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر سموئیل ہنٹنگٹن نے اچک لی اور ''تہذیبوں کا تصادم'' کے نام سے پوری کتاب لکھ دی۔ اب آپ نے ایک کتاب تحریر کی ہے جس کا نام ''بنیاد پرستیوں کا تصادم'' ہے۔ اس نظریے کے بارے میں آپ کے کیا خیالات ہیں؟

□ لیوس نے اپنا نظریہ دنیا کے متعلق ایسے اندازِ فکر پہ استوار کیا ہے جسے میں تسلیم نہیں کرتا۔ میں مسلمان دنیا میں پلا بڑھا اور ساری مسلمان دنیا میں خوب خوب سفر کیا۔ مسلم دنیا میں غصہ ہے مگر اس کے اسباب بہت واضح ہیں۔ اس غصے کا سبب عرب دنیا کے عین دل میں آبادکاروں کی ریاست کو مسلط کر دینا اور فلسطینیوں کے وجود اور شناخت کو ختم کر دینے کی کوششیں کرنا ہے۔ اسے کم اہمیت نہیں سمجھنا چاہیے۔ مجھے معلوم ہے کہ امریکہ میں یہ انتہائی حساس موضوع متصور ہوتا ہے۔ لیکن اسرائیل کی تشکیل اور اتنی بڑی یہودی آبادکاری سے پہلے عرب دنیا یہود دشمن نہیں تھی۔ یہودیوں کی بہت بڑی آبادی شمالی افریقہ میں حتیٰ کہ مشرقِ وسطیٰ کے مرکز مصر اور عراق میں رہائش پذیر تھی۔ بغداد کے یہودی تو جنم بھومی پر فخر کرتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو عرب یہودی سمجھتے تھے۔ وہ اپنی طباخی (کھانے پکانے) پر فخر کرتے تھے اور بلاشبہ لٹریچر اور نظریات سے ان کے لگاؤ سے ان پر جدت پسندوں کے اثر و رسوخ کا شائبہ ہونے لگتا تھا۔ ان میں سے بہت سے مصر اور عراق میں کمیونسٹ پارٹی کے بانیوں میں شامل تھے۔ وہ اپنی سوسائٹیوں میں بڑی جمی جمائی زندگی گزار رہے تھے۔ مگر یہ سب کچھ صیہونی منشور پر عمل درآمد اور اسرائیل کے قیام کے ساتھ ختم ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ اس کے نتیجے میں یہودیت

MashalBooks.com

کی شدید مخالفت پیدا ہوگئی۔ خدا کے لیے یہ مت سمجھئے کہ اس کی بنا اسلامی بنیاد پرستی ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے بیسویں صدی تک عرب دنیا میں یہودیت کی مخالفت اس شکل میں موجود نہیں تھی۔

چنانچہ اس غیظ و غضب کے بارے میں برنارڈ لیوس کا نقطہ نظر میرے مشاہدے سے مختلف ہے کیونکہ وہ اسے تہذیبی اختلافات کا ورثہ تصور کرتا ہے جبکہ میں انہیں بنیادی طور پر سیاسی اور معاشی صورت حال کا نتیجہ سمجھتا ہوں۔ ان ممالک کے شہری کہتے ہیں ''یہ ہمارا تیل ہے اسے ہمارے کنٹرول میں ہونا چاہیے۔ جب قوم پرست رہنما سامنے آتے ہیں جو ہمارے مفاد میں تیل پر اپنے حق پر زور دیتے ہیں تو آپ ان کے خلاف جنگ چھیڑ کر انہیں تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔'' یہی ناصر کے ساتھ ہوا۔ اس کے ساتھ تیل کی وجہ سے دو جنگیں لڑی گئیں، تیسری جنگ صدام حسین کے ساتھ لڑی گئی، جب اس نے کویت پر حملہ کیا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ امریکہ کی جانب سے آنے والے اشاروں کو صحیح طور پر سمجھ نہ سکا۔ لیکن وہ جو کچھ بھی کر رہا تھا۔ سوال یہ ہے کہ اب امریکہ کیا کر رہا ہے۔ (کیا یہ وہی حرکت نہیں جو صدام حسین نے کی تھی؟) اس نے بھی جو ایک حکومت بدلنے کی حرکت تھی وہ ایک چھوٹی ریاست تھی جو بلاشبہ اسے اشتعال دلا رہی ہے۔ تو وہ یہی کچھ کر رہا تھا، مگر اب امریکہ اسی راہ پر گامزن ہے تو قابل قبول ہے۔ جبکہ صدام کو اس حرکت کی سزا دی گئی تھی۔ چنانچہ لوگ ان تمام جنگوں کو تیل کی جنگیں سمجھتے ہیں اور اب ہم ایک اور جنگ عراق میں دیکھ رہے ہیں۔ یہ کوئی تہذیبی تصادم نہیں ہے۔ یہ مقامی باشندوں ... جو اتفاق سے مسلمان ہیں ... اور دنیا کے سب سے طاقتور سامراج کے درمیان تصادم ہے۔

اگر آپ ہننگٹن (Huntington) کی کتاب پڑھیں تو آپ دیکھیں گے کہ اس نے فارمولے دیئے ہیں، جنہیں 11 ستمبر کے سانحے کے بعد اس نے بدل دیا۔ وہ اپنی کتاب میں کہتا ہے کہ ہماری یعنی اہل مغرب کی تہذیب یہودی عیسائی تہذیب ہے اور اسے دو تہذیبوں، اسلامی اور چینی، کا سامنا ہے۔ وہ افریقی تہذیب کا ذکر نہیں کرتا کیونکہ اس کے خیال میں ایسی کوئی تہذیب موجود نہیں ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اہل مغرب کی تہذیب کو لاحق بڑا خطرہ چینی اور اسلامی تہذیبوں کے درمیان اتحاد سے ہے اور سرسری سا بین السطور مطالعہ بتاتا ہے کہ امریکہ کو چین کی برآمدات اور عرب تیل اس کے اشارے ہیں۔ میں نے اپنی کتاب ''بنیاد پرستوں کا تصادم'' میں اسے ایک ننھی سی بنیاد پرستی، جو بجائے خود انحطاط پذیر

ہے اور ترقی معکوس میں مبتلا ہے، اور تمام بنیاد پرستوں کی مادرِ نامہرباں اور سب سے بڑی سامراجی طاقت امریکہ کے درمیان کے تصادم ہے۔ تاریخ کا سب سے طاقتور سامراج، اب اپنی معاشی اور فوجی طاقت کے بل بوتے پر دنیا کے نقشے کو اپنے مفادات اور اپنی ضروریات کے مطابق نئی شکل وصورت دینا چاہتا ہے۔ اس وقت اس نے انتہائی مذہبی بنیاد پرستی کی صورت اختیار کر رکھی ہے جو کامیاب نہیں ہوگی کیونکہ اس کے پاس دینے کو کچھ نہیں۔ یہ بدل جائے گی اور نئی صورتیں آتی جائیں گی۔ یہ تصور کہ آپ ایک بڑی سلطنت قائم کر سکتے ہیں جو ساری دنیا پر غالب ہو اور کسی مزاحمت کا سامنا نہ ہو، ایک مضحکہ خیز تصور ہے۔

> کچھ اس عام امریکی سامع کے لیے فرمایئے جو ٹیلی ویژن پر یہ سن رہا ہے: ''اچھا، مسٹر علی، آپ نے کچھ باتیں بڑی دلچسپ کی ہیں، مگر مجھے ان پر یقین نہیں ہے۔ مجھے ذرا اچھی طرح سمجھایئے کہ امریکہ کیا گل کھلا رہا ہے اور دنیا کا نظام کیسے چلتا ہے؟ آپ کے پاس کیا تجاویز ہیں؟''

□ ایک تجویز تو میں یہ دوں گا کہ براہِ کرم تاریخ کو نظر انداز نہ کیجئے۔ امریکہ ہی میں نہیں بلکہ یورپ اور دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی تاریخ بطور مضمون کم مائیگی کی شکار ہوگئی ہے۔ امریکی تاریخ نہ صرف ایک ابھرتی ہوئی سامراجیت کی تاریخ ہے بلکہ اس کے خلاف احتجاج کی بھی ہے۔ مثال کے طور پر والٹ وِٹ مین (Walt Whitman) کو آزادی کا حامی، غلامی کا مخالف اور لنکن کا حامی شاعر تصور کیا جاتا ہے اور وہ اپنی زندگی کے آخر میں ایسا ہی گیا تھا۔ مگر اپنے ابتدائی سالوں میں وہ امریکہ اور امریکی گوروں کی برتر تہذیب پر پختہ یقین رکھتا تھا اور میکسیکو کو کچل دینے کا حامی تھا کیونکہ وہ میکسیکن تہذیب کو ادنیٰ سمجھتا تھا اور اس بارے میں اس نے بہت کچھ کہا۔ شروع میں امریکہ کے تمام قلمکار اور شاعر امریکی توسیع پسندی کے بارے میں ابہام کا شکار تھے لیکن آہستہ آہستہ وہ اس کے حامی ہو گئے تھے۔ انیسویں صدی کے آخر تک مارک ٹوین اور وِٹ مین کے ساتھ اس میں تبدیلی آ گئی۔ وِٹ مین نے جب دیکھا کہ خانہ جنگی میں کتنا لہو بہہ گیا ہے تو وہ شدید متاثر ہوا۔

میں ہمیشہ اپنے امریکی دوستوں سے کہتا ہوں کہ امریکہ ہر طرح سے ایک انتہائی امیر ملک ہے۔ یہ معاشی طور پر امیر ہے، یہ امریکہ کے اندر اختلاف رائے رکھنے والی تحریکوں کے اعتبار سے امیر ملک ہے۔ پھر یہ دنیا میں وحشت اور بربریت سے بھی مالا مال ہے۔ آپ کو

3

بش۔۔۔۔ بابل میں

11 ستمبر کے بعد ہم میں سے بیشتر لوگوں کے مابین بحث ہوئی اور تجزیہ کیا گیا کہ آخر یہ کیونکر ہوا اور آئندہ ایسے سانحات سے بچنے کے لیے کیا کرنا ہوگا۔ ابتدائی ہفتوں اور مہینوں میں، میں نے دنیا کے مختلف حصوں میں بش انتظامیہ اور ری پبلکن پارٹی کے نمائندوں کا سامنا کیا۔ یہ کوئی خوش گوار تجربہ نہیں تھا، مگر ضروری تھا۔ ہم نے ان سے پوچھا کہ آپ اصل میں چاہتے کیا ہیں؟ اگر آپ القاعدہ جیسی تنظیموں میں بھرتی رکوانا چاہتے ہیں تو ان سے نمٹنے کا ایک قطعی صاف راستہ موجود ہے۔ لیکن اگر آپ ان واقعات کو پوری دنیا میں مداخلت کا بہانہ بنانا چاہتے ہیں تو ہم اس کی حمایت نہیں کر سکتے۔ اس نے بلاشبہ مؤخر الذکر کو ترجیح دی۔

اگر انہوں نے مسلم اور عرب دنیا کی مایوسی کو حقیقی مسئلہ سمجھا ہوتا اور وہ نوجوانوں کو اس راستے سے ہٹانا چاہتے تو دو اسباب سامنے آتے۔ پہلا فلسطین، دوسرا عراق کے خلاف پابندیوں کی مہم جو تقریباً 12 سال سے اقوام متحدہ کی پالیسی بنی ہوئی ہے۔ اور عراق کے خلاف ہفتہ وار بمباری جو خلیج کی جنگ کے فوراً بعد شروع کی گئی تھی اور جس کی منظوری اقوام متحدہ نے دی تھی۔ عراق دنیا کے کسی بھی ملک کی نسبت زیادہ برسوں تک مسلسل بمباری کا نشانہ بنا رہا۔ حتیٰ کہ دوسری جنگ عظیم میں بھی کسی ملک کو اس قدر طویل اور مسلسل بمباری کا نشانہ نہیں بنایا گیا۔ عراق میں بمباری کی مدت، ویت نام میں بمباری سے بھی زیادہ ہے۔

یہاں اور یورپ میں انتظامیہ اور اس کے حمایتیوں سے ہم نے کہا کہ راستے دو ہیں۔ ایک یہ کہ جنگ کو جاری رکھا جائے، جس کے نتیجے میں زیادہ دہشت گردی جنم لے گی، زیادہ حملے ہوں گے اور زیادہ تشدد ابھرے گا اور دوسرا راستہ غور و فکر کے ساتھ ان مسائل کے سیاسی حل تلاش کرنا ہے۔ جہاں تک عراق کا تعلق ہے تو ہم زور دیتے ہیں کہ عراق کے خلاف

MashalBooks.com

پابندیاں اٹھالی جائیں جس نے اس ملک اور اس کی آبادی کو اپاہج بنا دیا ہے۔ اور جس کے نتیجے میں یونیسکو کے اعداد وشمار کے مطابق ... پانچ لاکھ بچے ناقص اور ناکافی غذا کے باعث لقمہ اجل بن گئے۔ ان پابندیوں نے لوگوں کو پہلے سے بھی زیادہ حکومت کا دست نگر کر دیا، تاکہ وہ زندہ رہ سکیں۔ انہیں صحت کی سہولتیں میسر آئیں اور امدادی قیمت پر کھانے کو ملتا رہے۔ ان پابندیوں نے لوگوں کو حکومت سے دور نہیں بلکہ زیادہ قریب کر دیا کہ ... یہ دونوں کام بیک وقت انجام نہیں دے سکتے کہ ایک طرف تو یہ واویلا کریں کہ یہ حکومت ایک بدی ہے، بڑی آمریت ہے، جبکہ ساتھ ہی دوسری طرف لوگوں کو اس کی طرف دھکیلتے چلے جائیں، اس کے قریب کرتے جائیں اس کا محتاج بناتے جائیں۔

مزید، ہم نے اصرار کیا کہ فلسطین کا مسئلہ حل کیا جائے۔ فلسطین پر اسرائیل کا مسلسل تسلط کبھی مسلم اور عرب دنیا کے لیے قابل قبول نہ ہوگا۔ یہ زیادہ تلخی، زیادہ مایوسی اور زیادہ غصہ پیدا کرنے کا موجب ہوگا۔ امریکہ اور اسرائیل دعویٰ کرتے ہیں کہ انہوں نے فلسطینیوں کو ہر قسم کی پیش کش کی، مگر انہوں نے قبول نہ کی۔ کوئی اس دعوے پر اعتبار نہیں کرے گا۔ کوئی پیشکش نہیں کی گئی، سوائے ایک مستقل طور پر زیر تحفظ ملک کی صورت قبول کرنے کے۔ جہاں تک معاہدۂ اوسلو کا تعلق ہے تو میرے آنجہانی دوست ایڈورڈ سعید نے کہا تھا کہ اس میں فلسطینیوں کے لیے کچھ نہیں۔ وہاں جو انہیں کمال پیش کش کی گئی وہ یہ تھی کہ چلو کچھ سمٹے سمٹائے نیم خود مختار بنتوستان کو قبول کر لو جو مختلف حصوں میں بٹا ہوا ہو اور ان کے درمیان اسرائیلی علاقے اور سڑکیں ہوں جن پر فلسطینیوں کو آنے کی اجازت نہ ہو۔ اس کے علاوہ وہاں اسرائیلی ہر وقت موجود رہیں اور سڑکوں پر اسرائیلی ٹینک گشت کرتے رہیں۔ نسلی امتیاز والے جنوبی افریقہ کے بنتوستان میں زیادہ آزادی تھی اس لیے دوبارہ انتفاضہ شروع ہوگیا تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ بغاوت اسرائیل اور شیرون کے خلاف ہی نہیں تھی بلکہ یہ فلسطینی قیادت کے خلاف تھی جس نے اوسلو کے بہانے یہ دستخط کیے تھے اور کچھ بھی حاصل نہیں کیا تھا۔ امریکہ نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔ اور پھر شیرون دہشت گردی کے خلاف جنگ میں امریکہ کا قابل قدر اتحادی بھی تھا۔

روس کا پیوٹن بھی اس جنگ میں امریکا کا اتحادی بن گیا۔ اس نے جتنے چیچن باشندے مارے اتنے ملاسووچ نے کوسوو کے مسلمان بھی نہیں مارے۔ گروزنی کے شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔ لیکن یہ سب جائز تھا کیونکہ پیوٹن دہشت گردوں کے خلاف لڑ رہا تھا۔

دُنیا بیٹھی دیکھ رہی تھی اور انسانی حقوق کے نام پر دوسرے ملکوں پر قبضہ جاری رہا۔ جہاں تک فلسطین کا تعلق ہے مغربی دُنیا بالخصوص امریکا نے آنکھوں پر پٹی باندھ لی ہے۔

شیرون کی حرکتوں پر امریکی اخبارو ں سے زیادہ اسرائیلی اخبارو ں نے نکتہ چینی کی۔ میں اخبار واشنگٹن پوسٹ اور نیویارک ٹائمنر کے لوگوں سے ملا تو میں نے پوچھا کہ آپ ہر ہفتے اسرائیلی اخبارو ں کی رپورٹ ہی کیوں نہیں چھاپ دیتے؟ یہ تو خود اسرائیلی ہیں جو نکتہ چینی کر رہے ہیں؟ یہ رپورٹیں عبرانی زبان میں ہیں آپ اسے انگریزی میں ترجمہ کر دیا کریں۔

شیرون کے مقبوضہ علاقوں میں جانے سے پہلے ایک اسرائیلی کرنل کے حوالے سے اسرائیلی اخبار مارلف میں چھپا کہ ''اگر سیاست دان ہمیں فلسطینی علاقوں پر تسلط جمانے کے لیے بھیجیں گے تو پھر لوگ چاہیں یا نہ چاہیں، ہمیں فلسطینیوں کو کچلنے کے لیے وہی حربے استعمال کرنے پڑیں گے جو وارسا میں جرمنوں نے یہودی اقلیتی بستی کو برباد کرنے کے لیے کیے تھے۔ یہ ایک اسرائیلی کرنل کہہ رہا ہے، فلسطینی نہیں۔ یہ اسرائیلی پریس میں چھپا اور انٹرنیٹ اور اختلافی ویب سائٹس پر بھی آیا۔ لیکن ... نیویارک ٹائمنر اور واشنگٹن پوسٹ کو تو بھول ہی جائیے یورپی اخبارات نے بھی اس کو رپورٹ نہیں کیا۔ حالانکہ وہ اس مسئلے کو اچھی خاصی کوریج دیتے ہیں۔ اسرائیل کے کچھ صیہونی رہنماؤں نے اس سلسلے میں انتہائی حیرت آفریں مداخلت کی۔ ان میں اسرائیلی پارلیمنٹ کا سابق سپیکر ابراہم برگ بھی شامل ہے، جس نے ہم وطنوں کو مخاطب کیا اور لکھا ''ہم کیا بن گئے ہیں؟ کیا تمہیں احساس ہے کہ تم فلسطینیوں کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہو؟ کیا تم بھول گئے ہو کہ خود ہم کیا کچھ جھیل چکے ہیں؟ کیا تمہیں احساس نہیں کہ اگر تم انہیں تلخی اور غصے کی اس انتہا پر پہنچا دو گے اور ان کے لیے کوئی راستہ نہیں چھوڑو گے تو ان کے لیے کوئی چارہ ہی نہیں رہ جائے گا سوائے اس کے کہ وہی کچھ کریں جو کام ہم کر رہے ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے اس کا انجام ٹھیک ہوگا؟'' اس نے لکھا ''مجھے ایک صیہونی ہونے پر شرمندگی محسوس ہوتی ہے۔ دوسرے لوگوں سے یہ سلوک تو ہمارا فلسفہ ہرگز نہیں تھا۔'' یہ مضمون اسرائیلی پریس میں شائع ہوا۔ اور پھر ہر ایک یورپی اخبار میں بھی اس کی مکرر اشاعت ہوئی۔ اس کا یورپ پر وسیع پیمانے پر اثر ہوا۔ برگ پھٹ پڑا کیونکہ اسے احساس ہو گیا تھا کہ صورت حال ناقابل دفاع ہے ... اور یہ اسی طرح جاری نہیں رہ سکے گی۔ اگر آپ لوگوں کو کچلتے چلے جائیں اور انہیں اس سطح پر لے آئیں جہاں زندگی موت سے بدتر قرار پائے گی تو لوگ آخری حربے کے طور پر ایسی ہی حرکات کریں گے۔ وہ یہ حرکات اس لیے نہیں کریں گے کہ یہ ان کی

MashalBooks.com

آرزو ہے، بلکہ اس کا باعث یہ احساس ہوگا کہ اب اور کوئی صورت باقی نہیں رہی۔

11 ستمبر کے سانحے کے بعد امریکہ نے اسرائیل کو 1967ء کی پوزیشن پر واپس جانے پر مجبور کرنے کا موقع کھو دیا کہ فلسطین کی خود مختار، آزاد اور جمہوری ریاست قائم ہو سکے۔ یہ ایک بہت بڑی غلطی تھی اور وہ اب اس کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔ یہ ایک عمل عرب نوجوانوں کی القاعدہ جیسی تنظیموں کی جانب رغبت کو کم کر سکتا تھا۔ مگر واشنگٹن نے یہ سیدھی راہ اختیار نہ کی۔ اس کے برعکس اس نے شیرون کو تھپکی دی۔

باب وڈورڈ کے مطابق، 11 ستمبر کے بعد ایک روز وائٹ ہاؤس میں نیشنل سیکورٹی کونسل کا اجلاس منعقد ہوا۔ میز کے گرد ذہانت و فطانت کے دیو بیٹھے تھے۔ ان میں بش، ڈک چینی، جان انس کرافٹ، کونڈولیزا رائس اور دوسرے شامل تھے۔ اور گرما گرم بحث چھڑی ہوئی تھی کہ کیا امریکہ کو افغانستان یا عراق پر ہلہ بول دینا چاہیے؟ عراق کا 11 ستمبر کے واقعے سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا، ہرگز کوئی تعلق نہیں تھا۔ القاعدہ کے رہنما عراقی حکومت سے نفرت کرتے تھے، کیونکہ یہ مکمل طور پر سیکولر تھی۔ شام اور عراق میں القاعدہ کے حامیوں اور بعث پارٹی کے کارکنوں کے درمیان کئی تصادم ہو چکے تھے۔ اگر وڈ ورڈ پر اعتماد کیا جا سکتا ہے اور اس نے چوٹی کے سرکاری ذرائع سے جو بات چیت کی، وہ قابل یقین ہے تو اس کے مطابق ... کونڈولیزا رائس کہہ رہی تھی کہ 11 ستمبر کے فوراً بعد 9/11 کے واقعے کی آڑ میں ہمیں دنیا میں ہر جگہ اپنی مجوزہ راہ پر چل پڑنا چاہیے۔

آخرکار وہ افغانستان میں گھس گئے جس کے بارے میں آج کل کچھ زیادہ تذکرہ نہیں ہو رہا۔ نہ اخبارات میں اور نہ ہی ٹیلی ویژن سکرین پر۔ مگر وہ مکمل طور پر ابتری کا شکار ہے، حامد کرزئی جسے کٹھ پتلی حکومت کا سربراہ بنا دیا گیا، نے کچھ بھی نہیں کیا۔ اتنی زحمت بھی نہ اٹھائی جتنی وہ اپنی خوبصورت شال اوڑھنے کے لیے اٹھاتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ افغانستان، جہاں اسے مقبولیت کا بڑا دعویٰ ہے حالانکہ اس کے مصاحبین میں صرف امریکی فوجی شامل ہیں، کی نسبت پیرس اور نیو یارک میں ''ماڈلنگ'' کا کمال دکھانے میں زیادہ مصروف ہے۔ کرزئی خاک بھی نہیں کر سکتا۔ افغانستان کا نظام شمالی اتحاد چلا رہا ہے اور وہ تسلیم کرتا ہے کہ اس کے پاس کوئی اختیار نہیں۔ کرزئی کا بڑا بھائی بالٹی مور میں ایک ریستوران چلا رہا ہے۔ کرزئی کی نسبت تو وہی کچھ نہ کچھ کر رہا ہے۔ کم از کم کچھ لوگوں کا پیٹ تو پال رہا ہے۔ حامد کرزئی تو یہ بھی نہیں کر رہا۔ میں امریکی انتظامیہ میں اس کے دوستوں اور برطانوی محکمہ خارجہ کو بتانا چاہتا ہوں

MashalBooks.com

کہ اگر وہ واقعی اسے پسند کرتے ہیں تو وہ اسے افغانستان سے نکال لیں کیونکہ وہاں انہوں نے اس کی زندگی کے دن ہی گھٹائے ہیں۔ یقین مانیں وہ زیادہ دیر نہیں رہے گا۔

طالبان جن کے بارے میں کہا گیا کہ وہ دنیا کی بدترین طاقت ہیں، کے ساتھ پس پردہ مذاکرات ہو رہے ہیں کیونکہ انہیں شمالی اتحاد پر اعتماد نہیں ہے۔ اگر اگلے برس کابل میں ایک نئے اتحاد کی حکومت قائم کر دی جائے، جس میں زیادہ تر سابقہ طالبان شامل ہوں، تو مجھے قطعاً حیرت نہیں ہو گی۔ مذاکرات تو ہو ہی رہے ہیں۔

اب آیئے عراق کی طرف —— تو جنگ کا مرکزی نقطہ کیا تھا؟... تیل... میں ایسا نہیں سمجھتا۔ کیونکہ بے شک انہیں تیل کی ضرورت ہے۔ مگر اس خطے کے دفاعی اخراجات پر جو کروڑوں ڈالر صرف کر دیئے گئے ہیں، کیا وہ صرف تیل کے لیے ہیں؟ تیل کے لیے تو وہاں پر موجود حکومت سے سودا کیا جا سکتا تھا۔ جیسا کہ انہوں نے 1980 کی دہائی میں کیا تھا، وہ بھی جب صدام حسین اپنی بدترین حالت میں تھا۔ چنانچہ اس جنگ کے پس منظر میں صرف تیل کا حصول ہی مقصد نہیں بلکہ یہ ایک سامراجی طاقت کی قوت کا مظاہرہ ہے، جو صرف عرب دنیا کو ڈرانے کے لیے ہی ہے اور اسرائیل کی تشفی کے لیے، جو ہر حال میں صدام حسین کو برخاست کرنے کا متمنی تھا کیونکہ وہ فلسطینیوں کی پشت پناہی کرتا تھا، اور مستقبل میں ایک طاقت وَر خطرہ بننے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ یہ مظاہرہ مشرق بعید میں اس کے تمام مخالفین کو متنبہ کرنے، حتیٰ کہ یورپ کو بھی مرعوب کرنے کے لیے ہے، کہ دیکھو ہم یہ یہ کر سکتے ہیں۔

ذرا ہیروشیما اور ناگاساکی کو ذہن میں لایئے، جہاں شہری آبادی کو ایٹم بم گرا کر دھوئیں میں اڑا دیا گیا۔ امریکہ نے ایک کی بجائے دو بم کیوں گرائے؟ اس لیے نہیں کہ امریکہ شکست سے دوچار ہو رہا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جاپان سقوط کے کنارے پر پہنچ چکا تھا۔ یہ بم سوویت یونین کو دھمکانے کے لیے گرائے گئے، حالانکہ وہ اس وقت امریکہ کا اتحادی تھا، تاہم جلد ہی اس کے مقابلے میں کھڑا ہونے والا تھا۔ سو اسے یہ بتانا لازمی تھا، کہ خیال رہے ہم یہ تک کر سکتے ہیں۔ ہاں ہمارے پاس ایٹم بم ہیں، جن کی کارکردگی تم نے دیکھ لی، اور یہ بلا تمہارے پاس نہیں ہے۔

سو عراق پر قبضہ، امریکہ کی بے پناہ فوجی طاقت کا مظاہرہ ہے تاکہ دنیا بھر میں امریکہ کے مخالف عبرت حاصل کر سکیں اور اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں کہ ہم کچھ کرنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ اور تم اس سے محروم ہو۔ یہ چینیوں کو ... اور جاپانیوں کے لیے تنبیہہ ہے کہ ہمارے ساتھ

پنگا نہیں لینا۔ ہاں۔

میں نے جنگ شروع ہونے سے قبل انہیں متنبہ کیا تھا کہ عراق پر قبضہ کوسوو پر قبضے کے مانند نہیں ہوگا۔ یہ ایک آزاد عرب ملک ہے اور نو عمر ملک ہے۔ جو بیس کی دہائی میں تشکیل پذیر ہوا تھا۔ اور جس نے 3 دہائیوں تک برطانوی سامراج کے قبضے کے خلاف مزاحمت کی تھی۔ عراق کے کچھ حصوں میں برطانوی سامراج کے خلاف مزاحمت تمام عرصہ جاری رہی۔ میں نے امریکیوں کو یہ بتانے کی کوشش کی کہ بہت سے عراقی صدام حسین سے متنفر ہو سکتے ہیں مگر وہ تمہارے ساتھ اس سے بھی زیادہ نفرت کریں گے۔

امریکیوں نے ہماری بات پر یقین نہیں کیا، بلکہ عراق کے غداروں اور اپنے اتحادیوں پر بھروسہ کیا۔ ان غداروں میں سے کچھ تو ان کے پے رول پر تھے اور ایا اس کے تمنائی تھے۔ کنعان مکیہ، فواد عجمی اور اس کے چیلے چانٹے وائٹ ہاؤس گئے اور انہوں نے امریکیوں کو بتایا کہ ان کے فوجی دستوں کا ''مٹھائیوں اور پھولوں'' سے استقبال ہوگا۔ یہ بات نیو یارک ٹائمز نے لکھی ہے۔

ہوا یہ کہ امریکی دستوں کا ہر جگہ مزاحمت اور مخاصمت سے ''استقبال'' ہوا، جس نے امریکی سپاہیوں کے حوصلے نہایت پست کر دیے کیونکہ انہیں تو قطعی طور پر دو متضاد ہدایات ملی تھیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ عراق ایک لڑاکا اور جنگجو ملک ہے جس کی قیادت سخت گیر وحشیوں کے ہاتھ میں ہے اور ان میں، خالص نسلی تعصب پایا جاتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ عراقی اپنی آزادی کے انتظار میں ہیں، ان دونوں مشنوں کے بارے میں مشترکہ اور واضح طور پر بات نہیں کی گئی لیکن دونوں کے لیے عموماً دعا ضرور مانگی جاتی تھی۔

فطری طور پر سپاہیوں نے دوسرے مشن کو ترجیح دی۔ وہ اپنے آپ کو یقین دلانا چاہتے تھے کہ وہ ایک ملک کو آزادی دلوانے جا رہے ہیں جو آزادی کے لیے تڑپ رہا ہے اور چیخ رہا ہے، لیکن جب وہ وہاں پہنچے، تو انہیں ایک دشمن آبادی اور قوم کا سامنا کرنا پڑا۔ کل کے نیو یارک ٹائمز نے رخصت پر وطن آئے ایک سپاہی کے حوالے سے لکھا ہے، ''جس چیز نے ہمیں ہلا کر رکھ دیا وہ ان لوگوں کا غصہ اور مخاصمت ہے جو ان کی آنکھوں سے ہم پر انگارے برسا رہا ہوتا ہے ہمیں اس ملک سے کیا لینا دینا تھا!'' بدقسمتی سے اب ان سپاہیوں کو احساس ہو رہا ہے کہ یہ تو ایک بے حد مشکل راستہ ہے۔

مجھے حیرت ہے کہ امریکیوں اور برطانویوں کی ایک بہت بڑی تعداد ہے جو یہ سمجھنے سے

قاصر ہے کہ عراقی امریکی تسلط کو پسند نہیں کرتے۔ یہ صورت حال تو عراقیوں نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی تھی۔ کوئی بھی یہ نہ سمجھ سکا، اور انہوں نے اس ملک پر قبضہ کرلیا، اور اب اس دلدل میں پھنس چکے ہیں۔

اگر عراق کی طرف سے مزاحمت نہ ہوتی، اگر امریکی، خواہ بے کیف، خاموشی میں یہاں داخل ہو گئے ہوتے، تو یہ جنگ ایک بڑی فتح تصور ہوتی اور وہ سب جو تھوڑی بہت تنقید کر رہے ہیں خاموش ہو جاتے۔ اس کے برعکس عراق میں مزاحمت نے کچھ ڈیموکریٹک سیاستدانوں کو ہمت دلائی ہے کہ وہ جنگ کے خلاف بیان دیں۔ وہ سب ایک دوسرے کو کہنیاں مار رہے ہیں۔ کیونکہ ان میں سے اکثر نے اس جنگ کی حمایت کی تھی جبکہ اب وہ دعوے کر رہے ہیں کہ ہم نے تو اس بارے میں پہلے ہی تحفظات کا اظہار کر دیا تھا۔ ہم نے ان کے تحفظات کے دعوے وقت پر کیوں نہ سنے؟ جب کانگریس میں جنگ کے بارے میں غیر متوازن ووٹ ڈالے گئے تھے۔ یہ مزاحمت شبہات کو ابھارنے کے لیے ضروری تھی، بعینہ ویسے، جیسے ویت نام میں مزاحمت اور جدوجہد نے ملک میں امن کی تحریک کو نئی بلندیوں سے آشنا کیا تھا۔ اس وقت ایک جدلیاتی اصول کارگر نظر آیا ہے کہ بیرونی مزاحمت اندر ہونے والی مخالفت... اور آج ہم عراق میں یہی کچھ دیکھ رہے ہیں۔

امریکی بڑی شدت کے ساتھ مزاحمت کو کچلنے کی کوشش کر رہے ہیں انہوں نے اقوام متحدہ کی جانب سے تائید کی آڑ لے رکھی ہے، چنانچہ وہ اقوام متحدہ کی تائید کی نفیری بجا سکتے ہیں۔ یہ ایک ایسا خطہ ہے جہاں اقوام متحدہ سے نفرت کی جاتی ہے۔ کیونکہ اس نے پابندیوں کے سلسلے میں کردار ادا کیا تھا۔ عراق میں نیلی ٹوپیوں والے کرائے کے فوجیوں کو لانا، یوکرائن یا بلغاریہ والوں کو لانے سے بہتر نہیں ہے۔ شمالی یورپ کے یہ ملک ایک زمانے میں ''سیٹلائٹ ممالک'' کہلاتے تھے، کیونکہ یہ وہی کچھ کرتے جو سوویت یونین کہتا۔ یہ اب بھی سیٹلائٹ ممالک ہیں کیونکہ اب بھی یہ وہی کچھ کرتے ہیں جو امریکہ چاہتا ہے۔ پرانی عادات مشکل ہی سے جاتی ہیں۔ خاص طور پر جب ان ممالک میں ایک سی حکومتیں موجود ہوں۔ انہوں نے فقط ظاہری لبادہ بدل دیا ہے۔

آج کل کی نوآبادیت نوآزادانہ معیشت کے دور میں پنپ رہی ہے۔ لیکن لحہ بھر کے لیے بھی یہ خیال دل میں نہ لائیں کہ نیولبرل پالیسی افغانستان اور عراق میں وہ کچھ کرے گی جو وہ اپنے یہاں نہیں کر سکتی۔ یہ لوگ اپنے ملکوں میں ہر چیز نجی ملکیت میں دے رہے ہیں۔ تعلیم

اور صحت کے شعبوں میں سرکاری بندوبست پر حملے کر رہے ہیں۔ ایسی صورت میں یہ عراق اور افغانستان میں تعلیم اور صحت کا کیا بندوبست کریں گے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکہ نے صرف ''مارشل پلان'' آگے بڑھایا کیونکہ اسے ایک سخت دشمن سوویت یونین کا یوں سامنا تھا۔ چین، ویت نام، انڈونیشیا اور کیوبا غرض ساری دنیا میں انقلاب پھوٹ رہا تھا۔ اب انہیں ضرورت تھی کہ نظام کو زیادہ پرکشش بنانے کے لیے کچھ اصلاحات نافذ کریں۔ مگر اب امریکہ کے مقابلے پر کوئی نہیں۔ چنانچہ فیصلہ کن حیثیت فقط دولت کو حاصل ہے۔

دولت اور منافع پر متفق ہو جانے والے امریکی عراق اور افغانستان کو کچھ نہ دیں گے۔ عراق کی تعمیر نو، جس کا ذکر ہو رہا ہے، کے ٹھیکے تقریباً مکمل طور پر امریکی فرموں کو ملیں گے۔ فرانس اور جرمنی اس پر معترض ہیں کیونکہ ان کی خواہش ہے کہ ان کی کمپنیاں بھی مقابلے پر ہوں۔ اور یہی ان دونوں فریقوں کے درمیان اختلاف ہے۔ مشرق وسطیٰ میں یوں لگ رہا ہے جیسے شمال اور جنوب کے درمیان جنگ ہو رہی ہو۔ جس میں شمال کے بہت سے جتھے مال غنیمت میں سے اپنا حصہ لینے کے لیے لڑ رہے ہیں۔ میں نے اپنی کتاب ''بش... بابل میں'' میں واضح کیا ہے کہ عراق پر برطانوی تسلط تین دہائیوں کے بعد کیوں ناکام ہو گیا۔ ان کے پاس تیس سال تھے۔ مگر وہ انہیں کام میں نہ لا سکے۔ 1940 کی دہائی میں برطانوی انٹیلی جنس ٹیم عراق کے مطالعاتی دورے پر گئی اور اس نے یہ نتیجہ نکالا کہ برطانویوں نے عراق میں بے ایمانوں پر مشتمل چندسری حکومت قائم کر رکھی ہے۔

ایک نئی طرح کی دُنیا تعمیر کرنے کا جذبہ زوروں پر تھا۔ آج کی دنیا میں عراق کی حالت بے ایمان چندسری حکومت کی نسبت زیادہ بری ہے، اگرچہ وہ غیروں کی بے ایمان چندسری حکومت تھی۔

برطانویوں نے بددیانت چمچے اور جاگیردار پیدا کیے، تاکہ اس ملک میں اپنے لیے ایک سماجی بنیاد قائم کر سکیں لیکن امریکہ سارے لوگ، باہر سے لا رہا ہے کیونکہ وہ عراقیوں پر اعتماد نہیں کرتا۔ حتیٰ کہ وہ لوگ جو بیرکوں کو صاف کر رہے ہیں وہ بھی جنوبی ایشیا یا فلپائن کے تارکین وطن ہیں۔ تو پھر وہ اس بات کی توقع کیونکر رکھ سکتے ہیں کہ عراقی ان پر اعتماد کریں۔

پال ولفوٹز (Paul Wolfowitz) بغداد میں پریس کانفرنس سے خطاب کر رہا تھا جس میں صرف مغربی نامہ نگار موجود تھے اور وہ انہیں بتا رہا تھا۔ ''میرا خیال ہے کہ تمام غیر ملکیوں کو عراق کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی بند کر دینی چاہیے۔'' بلاشبہ اس کا اشارہ

عرب ممالک کی طرف تھا، لیکن یہ لوگ اپنی ذات سے اس قدر بے خبر ہیں کہ ان پر طنز کرنا بے معنی ہے۔ ایک تہائی برطانوی فوج اور ہزاروں امریکی سپاہی ہزاروں میل سے آ کر ایک عرب ملک پر قابض ہو گئے ہیں۔ اور یہ احمق پریس کانفرنس میں کھڑا ہو کر کتنی ڈھٹائی سے کہہ رہا ہے کہ یہاں کا سب سے بڑا مسئلہ غیر ملکیوں کی موجودگی ہے۔ آپ کے ملک کا مرکزی صحافتی دھارا، جو کچھ آپ کو نہیں بتا رہا، وہ یہ حقیقت ہے کہ عراقیوں کی اکثریت غیر ملکی تسلط کی دشمن ہے۔ وہ اسے ہرگز پسند نہیں کرتے۔ اگر کسی معجزے کی بنا پر آزادانہ انتخابات منعقد ہو گئے تو نئی پارلیمنٹ جو پہلے دو مطالبے کرے گی وہ یہی ہوں گے کہ قابض فوج ملک سے نکل جائے اور تیل کا کنٹرول واپس عراق کو دیا جائے۔ پھر امریکی کیا کریں گے؟ پھر وہی کچھ کرنے پر وہ مجبور ہوں گے جو 1953 میں ایران میں کیا گیا۔ جب انہوں نے جمہوری طور پر منتخب کردہ محمد مصدق کی حکومت کا تختہ اس بنا پر الٹ دیا تھا کہ اس نے اینگلو ایرانین تیل کمپنیوں کو قومیا لیا تھا۔ وہ قطعاً پسند نہیں کرتے کہ تیل پیدا کرنے والے ملکوں میں جمہوری حکومتیں قائم ہوں کیونکہ وہ بہرحال ایک مستقل خطرہ ہوتی ہیں۔

وینزویلا میں مختلف طریقوں سے انتخاب کرائے گئے، پھر بھی چھ بار لوگوں نے شاویز کو منتخب کیا۔ اس کے بعد شاویز (Chavez) کو اقتدار سے الگ کرنے کی کوششوں پر نظر ڈالیے۔ حالانکہ دشمن بھی تسلیم کرتے ہیں کہ لاطینی امریکہ میں بہترین جمہوری آئین وینزویلا ہی کا ہے۔ امرا شاہی ان کے خلاف تھی مگر دو تہائی اکثریت اس کے حق میں تھی۔ چنانچہ شاویز نے یہ آئین جلدی سے ریفرنڈم کے ذریعے منظور کروالیا۔ اب یہاں تو امریکہ کے پاس عراق والا بہانہ بھی نہیں کہ یہاں جمہوریت نہیں ہے۔ پھر وہ اسے کیوں اتار پھینکنا چاہتے ہیں۔ وہ جنرل آپ کے پے رول پر کیوں ہیں۔ آپ کے تنخواہ دار کیوں ہیں جو شاویز کا تختہ الٹنا چاہتے ہیں۔

شاویز کو معزول کر دیا گیا۔ اور اڑتالیس گھنٹے کے لیے حوالات میں ڈال دیا گیا لیکن وہاں عوامی بغاوت ہو گئی۔ کارکس (Carcas) کی کچی بستیوں سے تمام لوگ گلیوں میں امڈ آئے۔ پانچ لاکھ افراد محل (Mur Flores) کی جانب چل پڑے۔ وہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ شاویز کو کہاں لے جایا گیا ہے۔ تختہ الٹنے والے جنرل نے انجانے میں فوج میں غدر پھیلا دیا۔ چیمبر آف کامرس کے صدر کو جو عیاری میں مشہور ہے اور وینزویلا کا احمد شیلابی تصور کیا جا سکتا ہے، کو نئے صدر کا حلف دلوایا گیا۔ اس جنرل نے فوجی بینڈ سے کہا، ''جب نئے صدر

سامنے آئیں تو قومی ترانہ بجانا۔ ٹیلی ویژن کیمرے موجود ہوں گے۔" بینڈ بجانے والے سپاہیوں نے انکار کر دیا۔ اور احتجاج کیا کہ شاویز ہمارے منتخب صدر ہیں۔ جنرل ایک سترہ سالہ بگل بجانے والے فوجی کی طرف مڑا اور اسے کہا کہ وہ صدر کے اعزاز میں نفیری بجائے لیکن یہ نوجوان جنرل سے کہنے لگا، ہم نے شاویز کو منتخب کیا ہے۔ وہی ہمارے صدر ہیں۔ جنرل کہتا ہے کہ تمہیں میرے حکم کی تعمیل کرنا ہوگی۔ اور نوجوان ترنت جواب دیتا ہے کہ پھر خود نفیری بجا لو اگر تمہیں اتنا ہی شوق ہے نئے صدر کو خوش آمدید کہنے کا۔

کون سی شے ہے جو نوجوان کو اتنا اعتماد بخشتی ہے؟ اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کی حکومت اسے توانائی بخشتی ہے، جو بہت انقلابی اقدامات نہ سہی لیکن اتنا ضرور ہے کہ تیل کی آمدنی تو غریبوں کی حالت بدلنے پر خرچ کر رہی ہے۔ یعنی وہی روز ویلٹ کے زمانے کا "نیو ڈیل پروگرام" اور بس۔ چنانچہ امریکہ نے صرف اس لیے شاویز کی حکومت گرانے کی کوشش کی کہ اسے مثال بنایا جا سکے۔

اگر آپ نیو یارک ٹائمز کا مطالعہ کرتے ہیں، تو آپ جانتے ہوں گے کہ بولیویا میں کیا ہو رہا ہے۔ ایک بدمعاش صدر کے خلاف عوامی بغاوت ہوتی ہے۔ مگر یہاں امریکہ صدر کا ساتھ دیتا ہے۔ ستر افراد کو گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔ انتہائی غریب لوگ گولی کا نشانہ بن رہے ہیں اور جمہوریت پسند امریکہ کا سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ قاتلوں کا حامی ہے۔ جب سامراج کا رویہ یہ ہوگا تو ان کے سب دعوے کہ 'ہم تو یہ سب کچھ جمہوریت کے مفاد میں کر رہے ہیں' دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ میں ان پر یقین نہیں رکھتا۔ معاف کیجئے گا۔ ریکارڈ ہمیں بالکل ہی مختلف تصویر دکھاتا ہے اور وہ یہ کہ امریکی جو کچھ بھی کرتے ہیں صرف اور صرف اپنے مفادات کو پیش نظر رکھ کر، کرتے ہیں۔ اور یہی سچ ہے، ہمیشہ کا سچ، خواہ امریکی سامراج اس پر عمل پیرا ہو یا برطانوی سامراج۔

اہل روم بھی ایسے ہی دلائل دیا کرتے تھے۔ برطانیہ میں ممتاز رومن پروکونسل نے (Agricola) کے بارے میں اپنے مضمون میں رومن مورخ ٹیکیٹس (Tacitus) کے حوالے سے ایک واقعہ لکھا ہے، کہ جب ایگری کولا نے برطانیہ کے ساحل پر کھڑے ہو کر سمندر پار آئرلینڈ کو دیکھا تو اس نے پوچھا کہ، یہ کیا ہے؟ مشیر نے جواب دیا کہ "آپ کو اس طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ یہاں کی زمین دلدلی ہے اور غیر متمدن قبائل آباد ہیں۔ یہ تہذیب سے عاری ہیں اور ان کے پاس ہماری عظیم سلطنت کو دینے کے لیے کچھ بھی نہیں۔" لیکن مسئلہ

یہ نہیں،'' ایگری کولا بولا، ''سوال یہ ہے کہ کیا یہاں رومن فوج کا قبضہ ہے کہ نہیں؟'' مشیر نے کہا کہ قبضہ تو نہیں ہے، تو ایگری کولا دھاڑا کہ یہی تو وہ جگہ ہے جہاں خطرہ چھپا ہوا ہے۔ کیونکہ برطانیہ کے لوگ سمجھیں گے کہ اگر یہ جزیرہ رومن تسلط سے محفوظ ہے تو ہم بھی کسی دن آزاد ہو جائیں گے۔

اس حکایت سے عراق پر قبضے اور شام پر مسلسل حملوں کا پس منظر واضح ہو جاتا ہے۔ یہ دو ملک جو ابھی تک امریکیوں کے بتائے ہوئے راستے پر غلامانہ چلنے سے انکاری ہیں انہیں اس خطے میں لازماً زیر کرنا ہوگا اور ان سے اسرائیلی غلبے کو تسلیم کروانا ہوگا۔

سامراج کی حتمی دلیل، جو وہ عرب دنیا پر حملہ کرتے ہوئے دیتے ہیں، یہ ہے کہ ہماری تہذیبیں جدا ہیں... یہ دلیل سیاستدانوں کی جانب سے نہیں زیادہ تر پالتو مفکروں، پنڈتوں اور پریس کی طرف سے آتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم عرب دنیا سے بہت مختلف ہیں۔ عرب اپنے آپ پر تنقید کے قابل نہیں۔ عرب ہر بات کا الزام امریکہ پر دھرتے ہیں۔ میں نے اکثر مغربی اخبارات و جرائد میں یہ دلیلیں پڑھی ہیں لیکن یہ قطعاً سچ نہیں ہے۔ درحقیقت، اگر آپ عرب دنیا میں سفر کریں تو آپ کسی بھی دارالخلافے میں کسی بھی چائے خانے یا کافی ہاؤس میں جا سکتے ہیں۔ وہاں آپ عرب حکومتوں پر سخت سے سخت تنقید سن سکتے ہیں۔ یقین کیجئے یہاں کی آبادی سیاسی طور پر خود امریکہ کی نسبت زیادہ آگاہ ہے۔ البتہ یہ ثقافتی تفاوت ہوسکتا ہے۔ اس بحث میں ہر شخص الجھا ہوا ہے۔ وہ جاننا چاہتے ہیں کہ ان کے بدقماش حکمران کیسے بدل سکتے ہیں۔ اور ان کی امریکہ سے دشمنی بھی اسی بنا پر ہے کہ امریکہ ان کے موجود حکمرانوں کی پشت پناہی کرتا ہے۔

دانشور اور شعرا جو کہہ رہے ہیں اس میں ناقابل یقین حد تک خود احتسابی اور خود تنقیدی کا عنصر شامل ہوتا ہے اور عرب دنیا میں یہ بہت عام ہے۔ وہاں ایسا ہرگز نہیں کہ لوگ امریکہ کو بلا وجہ اور بغیر کسی دلیل کے مطعون کرتے ہوں۔ وہ امریکہ پر الزام لگاتے ہیں تو اس لیے کہ اس نے مصر، سعودی عرب اور خلیجی ریاستوں اور عراق میں قابل نفرت حکومتوں کو تقویت بہم پہنچائی اور وہ آج کے دن تک اس پر عمل پیرا ہے۔ یوں امریکہ جمہوریت کا داعی اور وکیل نہیں بلکہ اس کے برعکس نظر آتا ہے۔

صدام کے ہاتھوں جلاوطن ہونے والے شعرا بھی اس قبضے کے خلاف ہیں۔ سقوطِ بغداد کے ایک دن بعد جب میں عظیم عرب شاعر سعدی یوسف سے ملا، تو وہ رو رہا تھا۔ اس نے کہا

کہ عراق میں تین بڑے شاعر تھے، ایک میں (سعدی یوسف)، (محمد مہدی) الجواہری، اور مظفرالنواب۔ الجواہری کا سو برس کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ صدام ہماری طرف قاصد پہ قاصد بھیجا کرتا تھا کہ ''مجھے معلوم ہے تم انقلابی ہو، مجھے علم ہے تم مجھ سے نفرت کرتے ہو، مگر تم عراق کا ورثہ ہو۔ آؤ اور بغداد میں اپنی شاعری سناؤ، وہاں دس لاکھ سامعین آپ کو سنیں گے۔'' وہ صحیح کہتا تھا... یقیناً وہ لاکھوں افراد ان تین عظیم شعرا کو سننے کے لیے بے تاب ہوتے۔ پھر سعدی یوسف نے کہا کہ ... ''مگر ہم کبھی نہیں گئے۔ جب امریکہ نے کمیونسٹوں کی فہرست صدام کو دی اور ان کا صفایا کر دینے کو کہا تو ان میں سے بہت سے افراد موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ صدام نے یہ ظلم امریکہ کے کہنے پر کیا۔ میرے ساتھی مظفرالنواب نے جلا وطنی میں کہا، ''صدام ہمیں قتل کر سکتا ہے، ہم اس پر اعتماد نہیں کرتے۔ ہم نے اس کے قاصدوں سے کہا کہ ہم نہیں آنا چاہتے۔ قاصد نے کہا۔ میری شاہ رگ آپ کی سلامتی کی ضامن ہے۔ بہرحال یہ زیادہ قابل یقین بات نہیں تھی۔''

عراق پر حملے سے ایک ماہ قبل وہ تمام جلا وطن، جنہیں اب سی آئی اے اور برطانوی انٹیلی جنس کی مدد سے اقتدار میں لایا گیا ہے، لندن کے ایک ہوٹل میں جمع ہوئے۔ یہ کام خفیہ تھا۔ سعدی یوسف نے لندن میں جلا وطنی کے دوران میں یہ دیکھا تو کہنے لگا، ''یہ گیدڑوں کی شادی ہے۔''

سعدی یوسف نے بات جاری رکھی ''جنوبی عراق کے لوگ گرما میں خنکی کے لیے ستاروں کی چھاؤں میں سوتے ہیں۔ ہر تین یا چھ ماہ بعد کسی نہ کسی گاؤں سے سناؤنی آتی کہ وہاں گیدڑوں کا ایک اجلاس ہوا ہے۔ وہ آتے، شور مچاتے اور جفتی کے لیے قطار بناتے اور وہاں ناقابل برداشت بدبو پھیل جاتی۔ اگلے روز دیہاتی اٹھتے۔ ایک دوسرے سے کہتے، کیا تم نے گیدڑوں کی شادی کی بو سونگھی؟ پھر یہ بات بھول جاتی، کیونکہ پھر مہینوں ایسا وقوعہ نہ ہوتا۔ جب لندن میں نام نہاد عراقی نیشنل کانگریس کے ان اتحادیوں کا اجلاس ہوا تو سعدی یوسف نے ''گیدڑوں کی شادی'' کے عنوان سے ایک نظم لکھی۔ اس نظم کی بنا پر اسے واپس عراق میں داخلے کی اجازت نہیں ملی۔ یہ نظم انٹرنیٹ کے ذریعے دنیا بھر میں پھیل گئی۔ چنانچہ عام لوگ بھی ان اتحادیوں کو ''گیدڑوں کی شادی'' کہتے ہیں۔

اے مظفرالنواب
میرے زندگی بھر کے ساتھی

ہم گیدڑوں کی شادی کے بارے میں کیا کر رہے ہیں؟
کیا تمہیں بیتے دن یاد ہیں:
شام کی خنکی میں
بانسوں کی چھت کے نیچے
عمدہ اون سے بھرے ہوئے تکیوں پر ٹیک لگائے
ہم چائے کی چسکیاں لیتے (وہ چائے جس کا ذائقہ ایک مدت سے کبھی نہیں چکھا)
دوستوں کے درمیان
رات، لفظوں کی طرح، نرمی سے گرتی ہے
کھجوروں کے سنولاتے ہوئے چھتناروں کے نیچے
جبکہ دھواں مرغولے بناتا ہوا، چولھوں سے اٹھتا ہے
اور ایسی خوشبو پھیلی ہوتی ہے
جیسے کائنات ابھی وجود میں آئی ہے

پھر بے ہنگم چیخیں پھٹ پڑتی ہیں
لمبی گھاس اور کھجوروں کے درختوں میں سے
گیدڑوں کی شادی
اے مظفر النواب
آج کا دن کل سا نہیں ہے
(سچائی بہت جلد جانے والی چیز ہے ... جیسے بچے کا خواب)
سچائی ہے۔ اس وقت جب ہم شادی کے استقبالیے میں ہیں
ہاں، گیدڑوں کی شادی
تم نے ان کا دعوت نامہ پڑھا ہے

اے مظفر النواب
آؤ ایک سودا کریں
میں تمہاری جگہ جاؤں گا
دمشق (لندن کے اس خفیہ ہوٹل سے بہت دور ہے)

MashalBooks.com

میں گیدڑوں کے چہروں پر تھوکوں گا
میں ان کی فہرستوں پر تھوکوں گا
میں اعلان کروں گا کہ ہم عراق کے باشندے ہیں
ہم اس سرزمین کے موروثی شجر ہیں
اور ہم بانسوں کی اس سادہ سی چھت کے نیچے، ناز کرتے ہیں

تو یہ عراق کے باشندوں کی روح ہے ... جو مزاحمت کر رہے ہیں، جنہوں نے صدام کے دورِ حکومت میں مصیبتیں جھیلیں مگر غیر ملکی تسلط قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

یوں پتہ چلتا ہے کہ سیاست اور ثقافت باہم کس طرح منسلک ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں کا ایک باہمی باطنی ربط ہے جسے مغرب کے لوگ سمجھنے سے قاصر ہیں۔ یوسف کا مخاطب مظفرالنواب بھی جلاوطن شاعر ہے جسے صدام نے قید میں بھی رکھا تھا اس نے ایران میں پناہ ڈھونڈ لی۔ شاہِ ایران نے اسے گرفتار کروایا اور تشدد کے بعد واپس عراق میں دھکیل دیا۔ وہ 1970ء کی دہائی کے اواخر سے جلاوطنی کی زندگی گزار رہا ہے۔ نوجوان عراقی اس کے بڑے مداح ہیں اور اس کی نظموں کی ٹیپ سارے عراق میں گردش کرتی ہے۔ اس نے لکھا:

میں نے مان لیا ہے کہ میرا مقدر
ایک پرندے کی طرح ہے
اور میں نے سب برداشت کیا ہے
سوائے تذلیل کے
یا اپنا دل محل سرا کی قید میں دینے کے
لیکن۔ اے پیارے خدا
پرندوں تک کے گھونسلے ہیں، جہاں انہیں واپس جانا ہوتا ہے
میں اپنے وطن کے اوپر سے اڑتا گزر جاتا ہوں
سمندر کے بعد دوسرے سمندر کے اوپر سے
اور پھر قفس کے بعد قفس اور پھر قفس
ہر داروغہ دوسرے سے جڑا ہے

ہم اس سامراج کا مقابلہ کیسے کر سکتے ہیں ... ایسا سامراج جس کا کوئی مدمقابل بھی

MashalBooks.com

نہیں۔ سیکورٹی کونسل اس کی لونڈی بن چکی ہے۔ جو حیرت کی بات نہیں۔ مقبوضہ علاقوں میں اس وقت تک مزاحمت جاری رہے گی جب تک قبضہ جاری رہے گا۔ امریکی اپنی بلندیوں کو چھوئیں یا پستیوں میں جائیں، مزاحمت جاری رہے گی۔ مقبوضہ عراق اور مقبوضہ فلسطین میں کبھی امن قائم نہیں ہو سکے گا۔

ہمیں اس سامراج کے مرکز میں، اس کے دل میں، مؤثر اپوزیشن کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ، امریکی سامراج کے شہری، نہایت اہم ہیں۔ یہ آپ کی اجتماعی ذمہ داری ہے کہ انتخاب ہوں تو باقی دنیا کی بقا کے لیے بش کو اقتدار میں نہیں رہنا چاہیے۔

حکومت کے بارے میں کسی خوف یا خبط کا شکار ہونا بے معنی ہے۔ اسے گرایا جا سکتا ہے، یہ اتنی طاقت وَر نہیں۔ لیکن اس کو گرانے کے لیے اپوزیشن کی ضرورت ہے۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ عراق اور امریکہ کے درمیان بڑا اختلاف کیا ہے؟ عراق میں اپوزیشن موجود ہے (آپ کے یہاں ڈیموکریٹ ہیں) مگر وہ ''گھمیرے'' (گھوم گھوم جانے والے) ہیں، آج ایک بات کہتے ہیں، کل دوسری۔ آپ کو ایک جان دار آواز کی ضرورت ہے جو جھوٹ کو ہر سطح پر چیلنج کر سکے۔ میرے خیال میں یہ عین ممکن ہے۔ لیکن اس کے لیے باصلاحیت سیاستدانوں اور حقیقی تحریک کی ضرورت ہے۔

اس ملک میں بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں اور اس پر یقین رکھتے ہیں کہ امریکی سامراج اور امریکی سامراجیت روسی انقلاب کے بعد وجود میں آئی۔ یہ سچ نہیں ہے۔ یہ سامراج ایک طویل عرصے سے موجود ہے، مگر یہ روایتی قسم کا سامراج نہیں ہے۔ یہ 1917 کے بعد ورلڈ پاور یعنی بین الاقوامی طاقت بنا۔ یہ نوآبادیاتی انداز کا قبضہ کرنے کی بجائے قابل اعتماد لوگوں کے توسط سے حکومت کرنے کو ترجیح دیتے ہیں اور ان لوگوں میں بھی ادل بدل کرتے رہتے ہیں خواہ وہ چند لوگوں پر مشتمل حکومت ہو یا فوجی آمریت یا سیاستدان۔ اس حوالے سے عراق کو استثنیٰ حاصل ہے، جیسے انیسویں صدی کے آخری سالوں میں فلپائن کو حاصل تھا۔

فلپائن پر قبضہ امریکی لبرل ازم کے لیے بہت سودمند ثابت ہوا۔ مارک ٹوین، ہنری جیمز، ولیم جیمز اور دیگر مفکرین اور دانش وَروں کے جم غفیر نے سامراج مخالف تنظیم (Anti Imperialist League) تشکیل دینے کا نعرہ بلند کیا تا کہ ایسے غاصبانہ قبضے کو روکا جا سکے۔ دو سال کے عرصے میں امریکہ کے پچیس شہروں میں چوتھائی ملین (دو لاکھ پچاس ہزار) افراد اس تنظیم کے ممبر بن گئے۔ اور اب اس چیز کی کمی ہے۔ جبکہ جھوٹ پر مستقلاً ضرب لگاتے

رہنے کی ضرورت ہے۔

ملک میں اپوزیشن بھی موجود ہے اور ناراضگی کا عنصر بھی، مگر اسے تحرک دینے کی ضرورت ہے۔ لیکن اگر آپ ''کوئی بھی ہو، بش نہیں'' کے جال میں پھنس گئے تو زیادہ مسائل پیدا ہوں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ خدارا بش کو معزول کیا جائے مگر ایسا غیر سیاسی طور پر ہونا ممکن نہیں۔ یہ حکومت بڑی ہولناک ہے، مگر یہ پچھلی حکومتوں سے مختلف نہیں۔ مشکل تو یہ ہے کہ لوگوں کا حافظہ کمزور ہے۔ ہم پیٹریاٹ ایکٹ پر ناراض ہیں، یہ بلاشبہ ذلت آمیز ہے۔ لیکن کیا ہمیں اٹارنی جنرل پالمر (Palmer) کے اچانک دھاوے بھول گئے ہیں جس نے بہت سے جرمنوں اور اطالوی تارکین وطن کو جیل میں ڈالا اور ملک سے نکال دیا۔ کیا ہم نے Cointelpro کو فراموش کر دیا ہے جسے ڈیموکریٹ انتظامیہ نے ویت نام کی جنگ کے دوران نافذ کیا تھا تا کہ جنگ مخالف تحریک کی جاسوسی کی جا سکے۔ اس طرح کے محکمے سامراجی حکومتوں کے دفاعی نظام کا جزو لاینفک ہیں اور یہ سب کچھ نیا نہیں۔ وہ جس دھمکی اور خوف کا مظاہرہ کرتے ہیں ہم اس میں مبالغہ نہیں کر سکتے۔ میں اس تصور سے متفق نہیں ہوں کہ اب اس کا معیار بدل گیا ہے۔

عراق پر قبضے کی اس بے ہودہ اور احمقانہ جنگ کا ایک مثبت نتیجہ برآمد ہوا ہے اور وہ یہ کہ موجودہ نوجوان نسل، پہلی نسلوں کی نسبت سیاست میں زیادہ ملوث ہو گئی ہے۔ جب بغداد پر بمباری شروع ہوئی شمالی امریکہ اور یورپ میں ہر جگہ ہزاروں طالب علم گلیوں میں ابل پڑے۔ وہ شدید نعرے لگا رہے تھے، یہ نعرے ان کی اپنی تخلیق تھے جو راک اینڈ پنک کے گیتوں سے اخذ کیے گئے تھے۔ لندن میں ان کے نعرے تھے۔ ''بم کس نے برسائے؟'' جنوب کے خلاف شمال کی اس جنگ میں سامراج نے اپنے مستقبل کے ممکنہ حریفوں پر آج ہی ضرب لگانے کا سوچا ہے۔ کسی بھی اور شے سے زیادہ ضروری ہے کہ سامراج کے مرکز میں بیٹھ کر اسے سیدھا رکھا جائے۔

MashalBooks.com

باب 4

سامراج میں شگاف

نینوا، اراور سمارہ کی طرح بابل بھی میسوپوٹیمیا کا عظیم شہر تھا۔ آپ نے اپنی کتاب کا نام ''بش ــــ بابل میں'' کیوں رکھا؟

یہ نام جبلی یا قدرتی طور پر میرے ذہن میں آ گیا۔ جب Amy Goodman نے ''آج کی جمہوریت'' پہ بات کرتے ہوئے مجھ سے یہی سوال پوچھا، مجھے فوری جواب دینا تھا اور میں نے کہا تھا کہ ''میرے خیال میں بش مشرق وسطیٰ کے جس قصبے سے واقف ہوسکتا ہے، وہ شاید بابل ہی ہو، کیونکہ قدیم عہد نامے میں اس کا ذکر موجود ہے۔ میں نے سوچا کہ اگر سوئے اتفاق یہ کتاب اس کی نظر سے گزری، تو وہ اس کے عنوان کو فوراً سمجھ جائے گا۔ کیونکہ یہی وہ جگہ ہے جہاں وہ حال ہی میں دلدل میں جا پھنسا ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں قدیم عہد نامے میں بابل کو ایک عیار قصبہ کہا گیا ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ بش عیاری میں لتھڑ گیا ہے۔ میں نے سوچا کہ سچے عیسائی اس نام کو سمجھ جائیں گے۔

آپ نے اپنی کتاب کا آغاز اس سوال سے کیا ہے'' کہ آخر امریکہ اور برطانیہ کے ذہین لوگوں کو یہ بات سمجھنے میں دقت کیوں محسوس ہوتی ہے کہ عراقی شہریوں کی اکثریت غیر ملکی تسلط سے نفرت کرتی ہے؟ ایسا کیوں؟

میرے خیال میں اس کا سبب یہ ہے کہ امریکہ کبھی کسی کے تسلط میں نہیں رہا۔کم از کم ایک جدید ملک کی حیثیت سے کبھی نہیں۔ 11 ستمبر کو چھوڑ کر آخری بار امریکہ کی سرزمین کو انیسویں صدی کے آغاز میں ضرب لگائی گئی تھی۔ برطانیہ کا بھی یہی معاملہ ہے۔ وہ رومن

MashalBooks.com

سامراج کے زمانے سے کسی کی غلامی میں نہیں رہا۔ چنانچہ ان دونوں ملکوں کے باشندے صحیح طور پر غیر ملکی تسلط کی اذیت کو سمجھنے سے محروم ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ہم ایک پر تکبر دنیا میں زندگی بسر کر رہے ہیں جو یہ سمجھتی ہے کہ امریکہ کے تسلط میں آنا تو خوش قسمتی کی بات ہے۔ چنانچہ وہ سوچتے ہیں کہ آخر اِن کا مسئلہ کیا ہے؟ یہ اتنے پریشان کیوں ہیں؟ ہم تو ان کی اچھی خاصی مدد کر رہے ہیں۔ تیسرا سبب یہ ہے کہ یہاں میڈیا کا مرکزی دھارا عراقی تاریخ سے بے بہرہ ہے۔ مجھے یہ جان کر بڑی تکلیف ہوئی کہ امریکن انٹیلی جنس ایجنسیوں کو بھی اس سے بہت کم واقفیت ہے، اگر کسی کو عراق کی تاریخ معلوم ہو... اور یقیناً برطانویوں کو معلوم ہے اور انہیں چاہیے کہ وہ ان لوگوں کو متنبہ کریں... تو وہ جانتا ہے کہ یہاں سامراجیت کی مزاحمت کی ایک طویل تاریخ ہے۔ اور آخری وجہ یہ ہے کہ ''فاکس نیوز'' جیسے نیٹ ورک، جو لوگوں کے شعور پر غالب آ گئے ہیں، عراق کی تاریخ اور ثقافت کی صحیح تصویر کشی کرنے میں ناکام ہو گئے ہیں۔ جب لوگوں میں جہالت کو اس درجے پروان چڑھایا گیا ہو، آپ چاق چوبند اور سمجھ دار باسیوں کی کیسے توقع کر سکتے ہیں؟

دوسری جنگ عظیم کے بعد جب برطانیہ نے ترکوں سے عراق چھین لیا اس کے بعد آپ کے خیال میں کیا ہوا؟ کیا مزاحمت ہوئی؟

یقیناً مزاحمت ہوئی۔ لوگوں کو یہ سمجھنا ہوگا کہ سلطنت عثمانیہ، اگرچہ بہت طاقت وَر تھی مگر اس میں بہت سی کمزوریاں بھی تھیں۔ اور وہ ایک سہل انگار اور ڈھیلی ڈھالی سلطنت تھی۔ جب تک مقبوضہ علاقے مرکزی خزانے میں رقم بھیجتے رہتے انہیں ان کے حال پر رہنے دیا جاتا۔ سلطنت عثمانیہ میں عرب دنیا منقسم نہیں تھی۔ یہ ایسی دنیا تھی جس میں دمشق، قاہرہ، بغداد اور یروشلم کو غلبہ حاصل تھا۔ یہ سلطنت عثمانیہ کے بڑے شہر تھے اور لوگ آسانی سے ان میں سفر کر سکتے تھے۔ سلطنت عثمانیہ کے نظام حکومت میں صوبے اور ولائتیں قائم تھیں۔ تین صوبے جن میں عراق تقسیم تھا، موصل، بغداد اور بصرہ تھے۔ ترکی نے جنگ عظیم اوّل میں جرمنوں کا ساتھ دے کر غلطی کی۔ اس بات پر غور کرنا کافی دلچسپی کا حامل ہے کہ اگر ترکوں نے اتحادیوں کا ساتھ دیا ہوتا تو مشرقِ وسطٰی کے حالات کیا ہوتے۔ جنگ کے بعد مشرقِ وسطٰی میں سلطنت عثمانیہ فرانس اور برطانیہ میں تقسیم ہو گئی۔ اور غالب طاقت کی حیثیت سے برطانیہ نے غالب حصہ قبضے میں لے لیا۔ لبنان اور شام فرانس کے حصے میں آئے۔ ہمیں طریق کار کا فرق

صاف نظر آتا ہے۔ جہاں برطانیہ کی حکومت تھی وہاں بادشاہت قائم کر دی گئی۔ کیونکہ ان کے اپنے ہاں یہی نظام قائم تھا۔ جہاں فرانس کی حکومت تھی وہاں جمہوریت نافذ کی گئی مگر اس پر فرانسیسیوں کو غلبہ حاصل تھا۔ چنانچہ مختلف نو آبادیاتی روایات سامنے آئیں۔ عراق برطانیہ کی نو آبادی تھا، وہاں ایک بادشاہ کی تلاش تھی اور وہاں یہ ''اعزاز'' حاصل کرنے والے بے شمار تھے۔ آخر کار سعودیہ میں موجود ہاشمی خاندان کو چن لیا گیا جن سے انہوں نے شام کا وعدہ کیا تھا۔ انہوں نے فیصل سے وعدہ کیا تھا کہ اسے عظیم عرب کا بادشاہ بنایا جائے گا۔ لیکن فرانسیسیوں نے کہا، نہیں ہم کسی طور بادشاہت پسند نہیں کرتے، چنانچہ اسے فقط عراق دے دیا گیا۔ وہ شروع ہی سے ناخوش تھا، کیونکہ اسے آزادی حاصل نہیں تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ برطانوی سامراج کی محض ایک کٹھ پتلی ہے۔ برطانیہ نے وہاں بیس، تیس اور چالیس کی دہائی میں حکمرانی کی اور کسی نہ کسی انداز میں مزاحمت جاری رہی۔ کرد آبادی پر کیمیائی ہتھیار پہلی بار برطانیہ نے استعمال کیے۔ ائرفورس نے کردوں کے دیہات پر کیمیائی بم پھینکے۔ تب بغداد میں عام ہڑتال تھی۔ عراقی فوج کے سپاہیوں نے موصل اور بصرہ میں مسلح بغاوت کر دی تھی اور ایسا ایک بار پہلے بھی ہو چکا تھا۔

> سیاٹل (Seattle) کے ایک انقلابی اور جابرانہ اقتدار کے مخالف جریدے نے امریکی فوج کے ایک کرنل کا حوالہ دیا کہ ''عراقی مزاحمت کو نظر انداز کرنا سنگین غلطی تھی۔ اگر کوئی ٹیکساس پر حملہ کر دیتا تو ہم یہی کرتے۔''

میں عراق پر غیر ملکی قبضے کے آغاز ہی سے یہ بات کر رہا ہوں کہ وہ لوگ جو واقعتاً جانتے ہیں کہ کیا ہو رہا ہے، امریکی فوجی اور افسر ہیں، کیونکہ وہ روزانہ اصلیت کو دیکھتے ہیں۔ میڈیا امریکی شہریوں کے سامنے جھوٹ بول سکتا ہے۔ لیکن وہ میدانِ جنگ میں موجود فوجیوں سے جھوٹ نہیں بول سکتا کیونکہ وہ جانتے ہیں کیا ہو رہا ہے۔ میں انٹرنیٹ پر پڑھتا ہوں۔ وہاں ایک عورت ہے۔ لیفٹیننٹ کرنل کیرن کویٹکووسکی (Kwiatkowski) جس نے پینٹا گان کے لیے پالیسی تجزیہ کار کے طور پر کام کیا، مگر اب عراق اور فلسطین پر ڈھائے جانے والے مظالم سے خوف زَدہ ہے۔ اس نے کہا کہ ہمارا ملک اس خطے میں جو کچھ کر رہا ہے، ہولناک حد تک قبیح ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ ایک عجیب طنز ہو گی، مگر کیا کیا جائے مناسب بھی یہی ہے۔ اگر وہ سب کچھ جو عراق میں ہو رہا ہے اس کی سچی تصویر آخر کار فوجیوں، یا مقتول فوجیوں کے

MashalBooks.com

خاندانوں یا بازو اور ٹانگیں کٹوا کر واپس آنے والوں کے توسط سے امریکہ میں منتقل ہو جائے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو ہم لوگوں کی نسبت کہیں زیادہ موثر طور پر اپنی کمیونٹی، علاقے اور بستی والوں کو سچائی اور حقیقت سے آگاہ کر سکتے ہیں۔

بولیویا کے پانی کی نج کاری کا ٹھیکے دار Bechtel عراق میں بھی کامیاب رہا ہے۔ جنگ میں اصل فتح تو ہیلی برٹن، لاک ہیڈ، بیکٹیل اور نارتھروپ کو ملی ہے۔

یقیناً منافع تو حاصل ہوتا ہے، لیکن کارپوریشنوں کی توقعات سے بہت کم۔ تعمیر نو کا کام شروع کرنے کے لیے آپ کو سیکورٹی گارڈز اور کرائے کے فوجیوں پر بہت بڑی رقم خرچ کرنا پڑتی ہے۔ اگر عراقی مزاحمت زمین کو جھلسا دینے والے حربوں کے ساتھ جاری رہتی ہے... تو زیادہ تر شہر پھر سے آگ کی لپیٹ میں آ جائیں گے۔ اور میرا خیال ہے کہ کچھ کارپوریشنیں اس سے ضرور آگاہ ہوں گی۔ چنانچہ میں سمجھتا ہوں کہ انہیں وہاں دھکیلا گیا ہے، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ وہاں سیکورٹی کی صورت حال تسلی بخش نہیں۔ میرے خیال میں وہ لوگ عراق میں کیفر کردار کو پہنچیں گے۔

''بش ــــ بابل میں'' کی ایک دلنواز خصوصیت، شاعری کا استعمال ہے۔ آپ کو ابتدا ہی سے علامہ اقبال، فیض احمد فیض اور دوسرے اہم شاعروں کے مطالعہ کا شوق رہا ہے۔ اپنی کتاب میں آپ نے نزار قبانی (Nizar Qabani)، سعدی یوسف اور مظفرالنواب جیسے اہم عرب شعرا کا کلام شامل کیا ہے۔ آپ نے اپنی قطعی سیاسی کتاب میں شاعری کے نمونے کیوں شامل کیے؟

کیونکہ سیاسی کلچر ثقافت سمیت، عرب ثقافت پر وسیع تر معنوں میں شاعری کو غلبہ حاصل رہا ہے۔ اور مغرب کے لوگ اس سے قطعی واقف نہیں۔ شاعری کسی بھی ثقافت میں نہایت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یہ محض اشرافیہ ہی کے ذوق کی تسکین کی چیز ہرگز نہیں جیسا کہ اسے مغرب میں مقام دے دیا گیا ہے۔ یہاں لندن میں شاعری کی محفل میں پچاس، حد دو سو لوگ شریک ہوتے ہیں۔ جبکہ عرب اور مسلم دنیا میں مشاعروں میں ہزاروں سامعین شامل ہوتے ہیں۔ میرا نوعمری کا زمانہ پاکستان میں گزرا۔ میں بھی مشاعروں میں جایا کرتا تھا۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد تقریباً ساڑھے دس بجے مشاعرے کا آغاز ہوتا اور صبح ناشتے تک جاری رہتا۔

MashalBooks.com

مشاعرے میں شعرا کے درمیان مقابلے کی سی فضا ہوتی، وہ مصرع طرح منتخب کرتے اور اس پر شعر کہتے۔ سامعین منصف کے فرائض انجام دیتے کہ کس نے اچھے اشعار کہے۔

اور وہاں ایک کہانی ہے جو بڑے عجیب انداز سے سامراج سے ہم رشتہ ہوتی ہے۔ امریکہ پاکستان پر فوج کے ذریعے حکمرانی کو ترجیح دیتا ہے۔ جب پاکستان میں پہلی بار 1958 میں فوجی انقلاب برپا کیا گیا تو فی البدیہہ کہنے والے پنجابی شاعر استاد دامن نے ایک مشاعرے میں اشعار سنائے۔ ہمارے کچھ نمایاں شعرا جیل میں تھے۔ انہوں نے ایک سیاسی نظم پڑھی، جس میں ادھر ادھر اڑنے والے پرندوں کا ذکر تھا۔ ہم نے کہا استاد جی، پرندے تو ہر جگہ اڑتے پھرتے ہیں، آپ آج کل کے حالات کے بارے میں اشعار بنائیے مگر انہوں نے اپنی وہی نظم جاری رکھی۔ ہم نے دباؤ ڈالا۔ وہ ناراض ہو گئے اور پھر فی البدیہہ کچھ اشعار کہے۔ پنجابی میں کہی گئی نظم کچھ اس طرح ہے، ''میرے دیس وِچ موجاں ای موجاں، جدھر ویکھو فوجاں ای فوجاں''۔ یہ نظم انہیں سیدھی جیل لے گئی۔ انہیں اگلے ہی روز دبوچ لیا گیا اور تین ہفتے کے لیے جیل بھیج دیا گیا۔ اگلی بار جب وہ ہم سے ملے تو انہوں نے کہا ''ادھر آؤ ناں ذرا ماں کے لعلو، خبردار جو آئندہ کسی مشاعرے میں کوئی فرمائش کی۔ ظالمو، جیل تو مجھے جانا پڑتا ہے، تم باہر مزے اڑاتے رہتے ہو۔'' تو یہ وہ روایت تھی، جس میں، میں پلا بڑھا۔

اور یہی روایت عرب دنیا میں موجود ہے اور بڑی پختہ ہے۔ یہ وہ روایت ہے جس کے تحت ممتاز شامی شاعر نزار قبانی یا فلسطین کے قومی شاعر محمود درویش یا ایسے دوسرے شاعروں کے کلام کو جب ام کلثوم سروں کا روپ دیتی ہے تو اس کلام کی کایا کلپ ہو جاتی ہے اور لاکھوں لوگ اس میں ڈوب جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ لوگ گلیوں بازاروں میں وہ اشعار گاتے پھرتے ہیں، اور ان شعرا کو دیوتاؤں کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔ ایسے ممالک جہاں سیاستدان حرام خور ہوں، اور لوگوں کی صحیح طور پر نمائندگی نہیں کرتے، وہاں شعرا لوگوں کا شعور بن جاتے ہیں۔ مغرب کے لوگ کہتے ہیں کہ: عرب تنقیدی ثقافت نہیں رکھتے، وہ ہمیشہ مغرب پر الزام لگاتے رہتے ہیں۔ اگر آپ عرب دنیا کی شاعری کا مطالعہ کریں تو آپ کو محسوس ہو گا کہ یہ کتنی لغو بات ہے۔ نزار قبانی حکمرانوں پر دوسرے شعرا کی نسبت زیادہ تنقید کرتا ہے۔ یہ شعرا اپنے حکمرانوں کے خلاف غیظ و غضب کا اظہار کرتے ہیں جس کے نتیجے میں انہیں عوام الناس میں عزت اور مقبولیت حاصل ہوتی ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ شعرا اچھے لوگ ہیں کہ وہ ہمارے لیے آواز بلند کرتے ہیں اور انہیں خریدا نہیں جا سکتا۔

MashalBooks.com

گزشتہ بار جب ہم جنوری 2003 میں ورلڈ سوشل فورم میں ملے تھے، اس وقت سے اب تک بہت کچھ رُونما ہو چکا ہے۔ آج 15 فروری کو میں آپ سے لوگوں کی جانب سے اپنے جذبات کے بھرپور اظہار کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہوں، آپ لندن میں امریکہ کے عراق پر طے شدہ حملے کے بارے میں کیے جانے والے مظاہرے میں شامل تھے۔ کیا آپ لوگوں کی بھرپور شمولیت پر حیران ہوئے تھے؟

یقیناً میں بے حد حیران ہوا۔ لندن میں ہمیں دو لاکھ افراد کی شمولیت کی توقع تھی۔ ہم کہتے تھے کہ اگر یہ تعداد اڑھائی لاکھ تک پہنچ گئی تو یہ ہماری خوش نصیبی ہو گی کیونکہ اس طرح یہ برطانوی تاریخ کا سب سے بڑا مظاہرہ ہو گا۔ لیکن جب میں مظاہرے میں پہنچا تو سکتے میں آ گیا۔ ہر طرف سر ہی سر نظر آ رہے تھے، تاحد نظر سر ہی سر۔ پہلے تو پولیس کا رویہ بڑا دوستانہ رہا۔ سینئر پولیس چیف میرے پاس آیا اور بولا، کہ آپ کو آج خاصا فخر ہونا چاہیے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ آپ کے خیال میں کتنے لوگ ہوں گے؟ خیال رہے کہ ابھی مظاہرے کا آغاز ہی ہوا تھا۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ ابھی تو لوگ امڈتے چلے آ رہے ہیں تاہم ہمارے لوگوں کا کہنا ہے کہ اس وقت پانچ لاکھ افراد سڑکوں پر ہیں۔ پھر جب وہ مظاہرین ہائیڈ پارک پہنچے، تو وہاں لندن میں پندرہ لاکھ مظاہرین جمع تھے، بلاشبہ یہ برطانیہ کی تاریخ کا سب سے بڑا مظاہرہ تھا، ہم نے ایسا حیرت انگیز منظر پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

اس مظاہرے کا اہتمام بھی ایک دلچسپ کہانی ہے۔ وہاں جو لوگوں کا بے پناہ ہجوم تھا، وہ لوگ محض بائیں بازو کے نہیں تھے، اور وہ ایسے لوگ بھی نہیں تھے جن کا ترقی پسندانہ مقاصد سے کوئی رشتہ یا تعلق تھا۔ یہ اس مظاہرے کا انتہائی متاثر کن پہلو ہے کہ وہ عام شہری تھے جو سیاستدانوں کے جھوٹ پر یقین نہیں رکھتے تھے، اور جو کہہ رہے تھے کہ ہم تو بس اتنا جانتے اور چاہتے ہیں کہ یہ جنگ روکو۔ یہ بات بھی بڑی دل پذیر ہے کہ وہ واقعی ایسا سمجھتے تھے کہ وہ اتنی بڑی تعداد میں سڑکوں پر آ کر واقعی جنگ کو روک سکتے ہیں۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ ایک اچھی اور مکمل دنیا میں ایسا ہونا بھی چاہیے۔ میں نے مظاہرین سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''مجھے اندیشہ ہے کہ جنگ نہیں رکے گی، اور یہ اس وقت تک نہیں رکے گا جب تک برطانیہ کی حکومت بدل نہیں جاتی۔ ہمیں اس غلامانہ ذہنیت کی حامل حکومت سے نجات حاصل کرنا ہو گی جو مستقل طور پر وائٹ ہاؤس کی پیروکار بنی ہوئی ہو۔ خواہ وائٹ ہاؤس میں کلنٹن براجمان ہو یا بش۔ جب تک ہم ایسی حکومت سے نجات حاصل نہیں کر لیتے یہ جنگیں چھیڑتے رہیں گے۔ ہم نے

یہ بھی پیشگوئی کی تھی کہ عراق میں مزاحمت ہوگی۔ امریکہ اور یورپ کے لوگوں نے ذہنی طور پر یہ سمجھ لیا تھا کہ وہ جنگ کو روک لیں گے۔ لیکن انہیں یہ احساس نہیں تھا کہ جنگ کا فیصلہ تو ہفتوں پہلے کر لیا گیا تھا۔

15 فروری کے مظاہروں کے دو دن بعد نیویارک ٹائمز نے صفحہ اول پر شائع کیا کہ نئی سپر پاور نے ''عالمی رائے عامہ'' کو ابھار دیا ہے۔ آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں۔

یہ بات خوش کن لیکن سچ نہیں ہے۔ رائے عامہ تو صرف رائے عامہ ہی ہوتی ہے۔ لیکن یہ کسی بھی طور پر اپنی خواہش کو زور سے منوا نہیں سکتی۔ ایسا صرف اسی وقت ہو سکے گا اگر یہ رائے عامہ حکومتی سیاستدانوں پر اثر انداز ہو سکے۔ لیکن کم از کم امریکہ میں تو کا اثر صفر ہے۔ ڈیموکریٹ سیاستدانوں نے کبھی اس کا نوٹس تک نہیں لیا۔ ڈیموکریٹس نے رائے عامہ کو قطعی نظر انداز کر دیا اور بش کی حمایت پر آ گئے۔ صرف چند ایک کو چھوڑ کر، سبھی نے جنگ کے حق میں ووٹ دیا۔ اور بنیادی طور پر بش کو ایک بلینک چیک دے دیا کہ وہ جو جی میں آئے کرے۔ برطانیہ میں مظاہروں نے محدود اثر ڈالا۔ مظاہرین کی تعداد اس قدر زیادہ تھی کہ لیبر پارٹی کی قابل ذکر تعداد واقعی گھبرا گئی۔ انہیں خدشہ لاحق ہو گیا کہ وہ دوبارہ منتخب نہیں ہو سکیں گے۔ چنانچہ انہوں نے پارلیمنٹ میں بلیئر کو چیلنج کیا۔ بلیئر نے اپنے آپ کو بچانے کے لیے بڑی ڈھٹائی سے جھوٹ بولا کہ عراق کے پاس وسیع پیمانے پر ہلاکت پھیلانے والے ہتھیار ہیں جو پینتالیس منٹ کے نوٹس پر برطانیہ پر حملہ کرنے کے لیے صف آرا کیے جا سکتے ہیں۔ اس نے کچھ پارلیمانی ممبروں کو اپنی طرف کر لیا۔ اگر لیبر پارٹی کے اندر اپوزیشن کو پندرہ یا بیس ممبر زیادہ مل جاتے تو بلیئر ہار گیا ہوتا اور اسے کنزرویٹو پارٹی کے ووٹوں پر انحصار کرنا پڑتا جو بڑی نامناسب بات ہوتی۔ وہ خود اپنی پارٹی کی طرف سے شکست کے کنارے پر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے جھوٹ ساری حدود پار کر گئے۔

آپ مظاہروں میں شرکت کرنے والے لوگوں سے کیا کہنا چاہیں گے؟ جنہوں نے جنگ سے پہلے مارچ کیا، احتجاج کیا، ای میلز بھیجیں اور خطوط لکھے۔ لیکن اب محسوس کرتے ہیں، ''ہم نے اپنی انتہائی کوشش کی، مگر ہم جنگ نہ روک سکے۔ چھٹی ہوئی، چلو اب گھر کی راہ لو۔'' اللہ اللہ خیر سلاّ۔

نہیں نہیں، ابھی کھیل ختم نہیں ہوا۔ اور لوگوں کو یہ بات سمجھنا ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ اس مظاہرے میں بہت سے لوگ ایسے تھے، جنہوں نے زندگی میں پہلی بار کسی مظاہرے میں حصہ لیا تھا اور انہوں نے سمجھا کہ جب عراق پر حملہ ہو ہی گیا تو کھیل ختم ہو گیا۔ لیکن جیسا کہ ہم دیکھ رہے ہیں کھیل جاری ہے۔ اب عراق میں مزاحمت ہو رہی ہے جو روز بروز بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ امریکی جرنیل جانتے ہیں کہ انہیں جزوی طور پر دھوکا دیا گیا ہے۔ وہ کسی حد تک نرغے میں آ گئے ہیں۔ اور اب وہ بھاگ نکلنے کا راستہ تلاش کر رہے ہیں۔ اس صورت حال میں جنگ کے خلاف بڑی بڑی تحریکیں جو فروری میں نمودار ہوئیں انہیں چاہیے کہ وہ اپنے کانگرس کے ممبروں، سینیٹروں اور پارلیمانی ممبروں کا گھیراؤ کریں اور انہیں کہیں، ''ہم نے تمہیں متنبہ کیا تھا، ہم نے تمہیں کہا تھا جنگ مت چھیڑو، لیکن تم آگے ہی بڑھتے چلے گئے اور اب ہمارے لوگ قتل کیے جا رہے ہیں، عراقی قتل کیے جا رہے ہیں۔ اب بھی وقت ہے اسے روکو۔''

اگر وہ دباؤ بڑھانا شروع کر دیں اور صرف مظاہروں پر اکتفا نہ کریں، کانگرس کے خاص خاص ممبروں اور سینیٹروں سے مل کر شکایت کریں تو اس کا کچھ نہ کچھ اثر ہوگا۔ کانگرس کے ممبروں کو غیظ و غضب کے اظہار سے بھرپور خط بہت بڑی تعداد میں موصول ہونے چاہئیں، جیسا کہ ویت نام کی جنگ میں شدت آنے کے بعد وصول ہوتے تھے، تو ان پر اثر ہوا تھا۔ ہمیں سینیٹ کی فارن ریلیشنز کمیٹی کے سامنے سینیٹر فل برائٹ کی سماعت کو دہرانے کی ضرورت ہے۔ مجھے وہ سماعت یاد ہے، جو ساری دنیا میں دکھائی گئی تھی۔ بی بی سی پر ہر رات فل برائٹ آتا اور وہ انتظامیہ کو خوب خوب لتاڑتا۔ بدقسمتی سے ہمارے پاس اس وقت ایسے مستحکم اور ایمان دار سینیٹرز کی بہت کمی ہے۔ ہاورڈ زن نے اپنی عظیم الشان کتاب A people's History of the United States میں شیلی کی ایک نظم کے چند مصرعے نقل کیے ہیں:

اُٹھو نیند سے جاگے شیر کی طرح
ناقابل شکست تعداد میں
اس شبنم کی طرح زنجیریں زمین پر گرا دو
جو سوتے میں تمہارے اوپر گرتی رہی ہے
تم بہت سے ہو اور وہ کم

بڑی عظیم نظم ہے اور پتہ دیتی ہے کہ انقلابی شاعری کی روایت فقط عرب یا مسلم دنیا تک محدود

نہیں۔ انیسویں صدی کے برطانیہ اور ریاست ہائے متحدہ میں یہ بہت قومی رنگ رہا ہے۔ اور یہ احیا کی صورت میں بھی اپنا آپ منوائے گا۔ صرف ایک شرط ہے کہ مغرب میں موجود ہمارے شاعر اپنی معاصر دنیا کے ساتھ رابطے برقرار رکھیں۔ شیلی کا پیغام نہایت صادق ہے اور اس میں عراق کی صورتحال کے حوالے سے بڑا پرلطف سبق ملتا ہے۔ اس وقت ریاست ہائے متحدہ واحد سپر پاور ہے اور دنیا کی واحد سلطنت بھی جسے ایسی عسکری برتری حاصل ہے کہ سائنس فکشن کے لکھاری خواب میں بھی نہیں دیکھ سکتے۔ وہ دو تین بٹن دبا کر پورے پورے ملک مٹا سکتے ہیں۔ لیکن جب آپ کسی ملک پر قابض ہوتے ہیں تو یہ ساری ٹیکنالوجی غیر متعلقہ ہو جاتی ہے۔ آپ کو ایک ناراض اور بیزار آبادی سے واسطہ پڑتا ہے۔ آج کل امریکی فوجی اسی طرح کی ایک آبادی کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ پھر سلطنت میں دراڑیں پڑنے لگتی ہیں۔ جو پہلے نظر نہیں آ رہی تھیں۔ آپ کو احساس ہوتا ہے کہ جب لوگ اُٹھ کھڑے ہوں تو آپ کچھ زیادہ طاقتور نہیں رہ جاتے۔ اس لیے کہ وہ آپ کا حکم ماننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ مزاحمت اسی طرح شروع ہوتی ہے۔ یہی مزاحمت مقبوضہ لوگوں میں شعور بیدار کرتی ہے۔ قابض لوگوں کا ضمیر بھی جاگنے لگتا ہے۔ مسلط سلطنتیں مزاحمت کو جنم دیتی ہیں اور بالآخر یہ مزاحمت خود سلطنت پر اثر ڈالتی ہے۔ یہی سلطنتوں کی تاریخ ہے اور ریاست ہائے متحدہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔

> ریاست ہائے متحدہ میں زیادہ تر شائستہ بحث اس مخصوص مسئلے کے گرد مرکوز ہے۔ ابھی حال ہی میں نیو یارک ٹائمز میگزین میں ڈیوڈ ریف کی ایک کور سٹوری ''Blueprint of a Mess'' اسی طرح کے استدلال کی عکاس ہے۔ بہت تھوڑے لوگ ہیں جو امریکہ کے لیے خطرہ نہ بننے والے ملک کو غیر قانونی اور غیر اخلاقی قرار دیتے ہیں۔

یہی جنرل ریمزے کلارک کا موقف ہے جو کہتا ہے کہ قبضے کا اصل مسئلہ یہ نہیں کہ یہ ہو گیا بلکہ یہ ہے کہ کس طرح کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ اس کے پاس اس کام کا کوئی اچھا طریقہ موجود ہوگا۔ یہ لوگ یہیں غلطی کر رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ یہ عرب دنیا میں بھی بلقان کا تجربہ دہرا سکتے ہیں۔ اگر اقوام متحدہ نے بھی شروع سے ہی قبضے کی منظوری دے دی ہوتی اور برطانوی اور امریکی فوج کے شانہ بشانہ فرانسیسی اور جرمنی دستے بھی لڑتے تو نتائج یہی ہوتے۔ بس اموات کا اشتراک پیدا ہو جاتا۔ اگر اقوام متحدہ کے نیلے ٹوپیوں والے دستے بھی جاتے تو

ردعمل ایسا ہی معاندانہ ہونا تھا۔ اس لیے کہ اقوام متحدہ نے بھی عراق پر پابندیاں لگوانے اور بارہ برس تک امریکہ اور برطانیہ کو عراق پر ہر ہفتے بمباری کی اجازت دیے رکھی۔ انہیں اقوام متحدہ سے بھی نفرت ہے۔ اس کا کوئی علاج نہیں۔ اصل غلطی قبضہ ہے نہ کہ قبضہ کرنے کا طریقہ۔

آپ نے ''Bush in Babylon'' میں مزاحمت کاروں کو ''The Maquis'' کہا ہے جو چالیس کے عشرے میں نازیوں کی مزاحمت کرنے والے بہادر فرانسیسیوں کا امیج اختیار کر لیتے ہیں۔ لاس اینجلس ٹائمز میں اصطلاح ''مزاحمت'' کے حوالے سے کچھ تنازعہ بھی چلا ہے۔

لاس اینجلس ٹائمز کی انتظامیہ نے اپنے صحافیوں سے کہا ہے کہ وہ عراقی مزاحمت کے لیے یہ لفظ مزاحمت استعمال نہ کریں۔ اس کی بجائے وہ گوریلا اور حتیٰ کہ دہشت گرد استعمال کر سکتے ہیں۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ وہ جتنا چاہیں نام بدل دیں لیکن لوگوں کو سدا کے لیے احمق نہیں بنایا جا سکتا۔ عراق میں کلاسیکی مزاحمت سامنے آ رہی ہے اور یہ فرانس کے مقابلے میں کہیں زیادہ تیز رفتاری سے سامنے آئی ہے۔ فرانسیسی مقبوضہ فرانس میں مزاحمت کو اپنا آپ منوانے میں لمبا وقت لگا تھا۔ سی آئی اے کی پیشرو امریکی تنظیم ''او ایس ایس'' اور برطانوی خفیہ ایجنسیوں نے مزاحمت کاروں کو تربیت دی تھی۔ انہیں ریلوے لائن اڑانے، بم پھینکنے اور قابض افسروں کو ہلاک کرنے کی تربیت دی گئی تھی۔ انہیں کبھی دہشت گرد نہیں کہا گیا۔ انہیں مزاحمتی (The Maquis) کہا گیا۔ فرانس میں ایک اور بڑا فرق بھی تھا۔ پرانی مقتدرہ کے ایک قابل ذکر حصے نے جرمنوں سے تعاون کیا۔ وشی (Vichy) حکومت کوئی چھوٹی سی اقلیت نہ تھی۔ عراق کی کٹھ پتلی حکومت باہر سے مسلط شدہ ہے۔ احمد شلابی کو امریکہ سے لایا گیا جس نے اپنے لیے کرائے کے دوسو فوجی بھرتی کیے اور انہیں بغداد میں تعینات کر دیا اور پھر بھی سمجھتا ہے کہ وہ مقبول ہو جائے گا۔ فرانس میں آبادی کا ایک حصہ جرمن تسلط پر خوش تھا۔ عراق میں یہ معاملہ نہیں۔ شائد ہی کچھ لوگ ہوں گے جنہیں امریکہ یا برطانیہ کے قبضہ کی خواہش ہو۔ صدام کے شدید ترین مخالف بھی یہ نہیں چاہتے۔ وہاں کلاسیکی مزاحمت متشکل ہو رہی ہے جس طرح کی الجیریا، ویت نام اور افریقہ کے کچھ حصوں میں ہوئی تھی۔ اس کا آغاز اسی طرح کا ہوتا ہے۔

''معروف فلسطینی امریکی پروفیسر اور مصنف ایڈورڈ سعید کا انتقال ستمبر میں ہوا ہے۔ وہ اپنے ایک مضمون میں لکھتا ہے ''عرب تمدن اور تہذیب کو ریاست ہائے متحدہ سے ایک گہری خلیج الگ کرتی ہے۔ عرب لوگوں کا تشخص جس کی بنیاد روایات اور تمدن پر ہے، ریاست ہائے متحدہ کے لیے ناقابل قبول ہے۔ انہیں انسانوں سے کم تر سطح پر رکھا جاتا ہے۔ متشدد اور بے شعور دہشت گرد گردانا جاتا ہے جو ہمہ وقت قتل و غارت اور بمباری کے لیے تیار ہیں۔ جنگ عظیم دوم کے بعد سے لے کر امریکی خارجہ پالیسی میں عربوں کے متعلق یہ نفرت اور مجنونانہ خوف بنیادی تصور کے طور پر چلا آ رہا ہے۔''

ریاست ہائے متحدہ نے اسلامی تنظیموں کے متعلق بھی یہی مبنی برخبط اندازِ فکر اختیار کیا ہے۔ کمیونسٹ اور سیکولر حکومتوں کے خلاف بھی ان کا یہی خیال ہے۔ 1967ء کی جنگ نے ایڈورڈ کے سیاسی شعور کو متشکل کیا۔ اس کا کہنا ہے کہ اس سے پہلے وہ ان معاملات میں دلچسپی نہیں لیتا تھا۔ 1967ء کی جنگ نے اس کی زندگی بدل ڈالی۔ اس جنگ میں عرب دنیا اور فلسطین اس کے بنیادی مسائل بن گئے۔ یہ جنگ بڑی فیصلہ کن تھی کیونکہ امریکہ نے مصر اور شام کی قوم پرست حکومتوں کو ہٹانے کے لیے اسرائیل کو برتا۔ ان ملکوں کی شکست کے نتیجے میں عین نقطہ عروج پر موجود عرب قومیت پرستی کی موت ہو گئی۔ اس تحریک نے عربوں کو متحد کرنا چاہا لیکن ناکام رہی۔

مجھے پچاس کے عشرے کے اواخر کا زمانہ یاد ہے جب آپ ریڈیو بغداد، قاہرہ اور دمشق سنتے تھے کہ عرب شہریوں کو اپنی مغرب نواز بادشاہتوں کے خلاف بغاوت کر دینا چاہیے۔ نتیجتاً سعودی عرب میں قومی انقلاب لانے کی کوشش بھی ہوئی اور یہ بغاوت سعودی فوج کے اندر سے اٹھی۔ قوم پرستوں کو ایک سبق سکھایا جانا تھا اور یہ کام اسرائیلی کیا کرتے تھے۔ عربوں کو ایک متحد اکائی کے طور پر دکھانے کا پروپیگنڈہ مخصوص مقاصد کے تحت کیا گیا۔ حالانکہ معاملہ کبھی ایسا نہیں تھا۔ عربوں کے درمیان ہمیشہ سے تقسیم موجود تھی۔ جب امریکیوں کی مدد سے عرب دنیا کی تمام سیکولر تحریکوں کو کچلا جا چکا تو وہ شکایت کرنے لگے کہ عرب دنیا میں حقیقی حزب اختلاف صرف اسلام پسند ہیں۔ اس کی بنیاد بھی امریکہ نے رکھی جس نے متبادلات مٹا دیئے تھے۔ آج امریکی سلطنت کو صرف اسلامسٹوں کی مخالفت لاحق ہے۔ سیکولروں کو خوف زدہ یا بے حوصلہ کر دیا گیا۔ یا ان کا وجود جسمانی طور پر بھی مٹا دیا گیا۔ پھر این جی اوز نے سوچے سمجھے

منصوبے کے تحت بہترین لوگ چن لیے اور انہیں سمجھا دیا کہ اگر انہیں فنڈ یا معاونت لینی ہے تو سیاست میں براہِ راست ملوث نہ ہوں۔

بدقسمتی سے این جی اوز کے سبب سیکولر دانشور سیاست سے نکل گئے۔ مسلم دنیا میں این جی اوز کے اثرات کو باضابطہ طور پر دیکھنے کی ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر پاکستان کے افغانستان کی سرحد کے ساتھ لگتے دو اہم صوبوں میں حالیہ انتخابات اسلام پسند جماعتوں نے جیتے جبکہ اس سے پہلے انتخابات میں انہیں کل ووٹوں کا بمشکل پانچ یا چھ فیصد ملتا تھا۔ ان جماعتوں کے رہنماؤں میں سے ایک نے کھل کر کہہ دیا کہ یہ نتائج کیوں کر نکلے۔ اس لیے کہ دیگر جماعتوں نے میدان چھوڑا اور ان کے حق میں دے دیا۔ ہم نے مذہب استعمال نہیں کیا۔ ہم نے یہ بھی نہیں کہا کہ ہم اسلامی قانون نافذ کریں گے۔ ہم نے فقط اتنا کیا کہ امریکی ریاست پر تنقید کرنے لگے۔ کسی اور نے یہ نہیں کیا۔ اسی نے ہمیں انتخاب جتوا دیا۔

> عراق پر توجہ کے سبب افغانستان کسی حد تک توجہ سے ہٹ گیا ہے لیکن وہاں بہت کچھ ہو رہا ہے۔ طالبان کی سرگرمی پھر بڑھ رہی ہے۔ نیو یارک ٹائمز کے ایک ایڈیٹوریل کے مطابق افغانستان میں جنگجوؤں اور طالبان کے امتزاج کا خطرہ عود کر آیا ہے۔ یہ افغانستان میں کیا ہو رہا ہے۔

بہت سادہ سی بات ہے۔ بنیادی طور پر ریاست ہائے متحدہ نے شمالی اتحاد کے جنگجو سرداروں کے ساتھ سودا کیا تھا۔ امریکیوں کو لڑنا نہیں پڑا اور طالبان بھی بہ گئے۔ میں نے اس وقت بھی کہا تھا کہ طالبان نہیں لڑیں گے۔ طالبان کا اسامہ کے ساتھ موجود طبقہ غائب ہو جائے گا اور پاکستان کے زیر کنٹرول طبقہ واپس نکال لیا جائے گا۔ یہی ہوا۔ جنگ دو تا تین ہفتے ملتوی رکھی گئی تا کہ پاکستانی فوج اپنے سپاہی اور طالبان جنگجوؤں کی ہر ممکن تعداد نکال لے۔ طالبان کے اپنے طور پر اور مکمل آزاد قوت ہونے کا تصور درست نہیں۔ پاکستانی معاونت کے بغیر یہ لوگ کبھی کابل پر قابض نہیں ہو سکتے تھے۔

مئی 2003ء میں میں نے اسلام آباد میں ''اقبال احمد لیکچر'' دیا اور وہاں غیر فوجی لباس میں ملبوس پاکستانی جنرلوں کو طعنے دیے۔ میں نے کہا، ''اپنے لوگوں کے علاوہ تمہاری واحد فتح کا تعلق کابل پر قبضہ سے ہے۔ یہی تمہاری سب سے بڑی فتح تھی۔ لیکن اب تم اپنی اس واحد فوجی فتح کو چھوڑ کر بھی واپس آ گئے ہو۔'' اس کے بعد میرے پیچھے پیچھے ایک اعلیٰ سرکاری افسر

کراچی آیا اور اس نے مجھے بتایا کہ اوپر سے آپ کے لیے ایک پیغام ہے۔ ''ہم نے اپنی فتح صرف عارضی طور پر چھوڑی ہے۔ ہم واپس جائیں گے اور اس بار بغیر داڑھیوں کے جائیں گے تا کہ امریکی خوش ہو جائیں۔'' پاکستانی فوج میں بھی اس طرح کا بڑا خبط ہے۔

افغانستان میں بہت دلچسپ صورتحال پیدا ہوگئی ہے۔ امریکہ نے یہاں حامد کرزئی کو حکمران بنوایا ہے جو امریکی خفیہ ایجنسیوں کے لیے کام کرتا تھا۔ اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اس نے کسی بھی افغان کو اپنے پہرے داروں میں شامل کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے سارے پہرے دار امریکی فوجی ہیں۔ اس کی واحد خوبی اس کی خوبصورت شال ہے۔ وہ افغانستان میں رہتا ہے تو اس دنیا سے کٹ کر رہے گا۔ وہ قطعی طور پر بے جواز اور ناجائز ہے۔ کابل سے باہر باقی تمام افغانستان شمالی اتحاد اور مختلف گروپوں کے پاس ہے۔ طالبان کا ایک گروہ حملے کی تیاریوں میں لگا ہے جبکہ دوسرا کرزئی کے ساتھ سودا بازی چاہتا ہے۔ طالبان کا وہ بازو جو پاکستانی فوج کے کنٹرول میں ہے زلمے خلیل زاد کے ساتھ خفیہ بات چیت میں لگا ہے جو افغانستان میں امریکی پروکونسل ہے۔ امریکی اس کوشش میں ہیں کہ طالبان کے اس گروہ کے ساتھ کام کرتے ہوئے شمالی اتحاد کو نہتا کر دیں جو ایک بار پھر اپنی اصل میں آ جائے گا۔

آپ کو افغان جنگ کی شروعات یاد ہے۔ جب لارا بش اور چیری بلیئر افغان عورتوں کو آزاد کرانے کی بات کرتی تھیں۔ یہ خیال میرے لیے بالکل نیا تھا۔ یعنی عورتوں کو آزاد کروانے کے لیے سامراجی مداخلت کا خیال۔ لیکن بالآخر صرف اتنا ہوا کہ افغانستان ٹیلی ویژن پر خاتون اناؤنسر کی کچھ تصویریں دیکھنے کو ملیں۔ عرصے سے وہ بھی غائب ہے اور خواتین کی حالت ہمیشہ کے لیے خراب ہے جبکہ زنا بالجبر کے واقعات بڑھ گئے ہیں۔ صرف ایک تبدیلی آئی ہے کہ قبضے سے پہلے ہیروئن کی تجارت پر طالبان اور شمالی اتحاد قابض تھے۔ طالبان کی ہیروئن پاکستان کے ذریعے جاتی تھی اور شمالی اتحاد اپنی ہیروئن وسط ایشیا اور روس کے ذریعے کوسووو تک بھیجتا جہاں اس کی مزید تقسیم ہوتی۔ اب ہیروئن پر شمالی اتحاد کی اجارہ داری ہے اور بشمول فوج مختلف پاکستانی حلقوں کو نقصان ہو رہا ہے۔

بلیئر کے ایک رکن پارلیمنٹ بل ریمل نے جنگ کے جواز میں دیئے گئے سارے دلائل ایک طرف کرتے ہوئے فقط دو دلیلیں دی تھیں: جس کسی نے بھی جنگ پر تنقید کی وہ امریکہ خلاف تھا اور کیا عراقی بہتر نہیں ہوں گے؟ کیا صدام کے جانے سے دنیا بہتر نہیں ہوگی؟ آپ ان دلائل پر کیا کہتے ہیں؟

امریکہ خلاف ہونے کی دلیل سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ امریکہ واقعی ایک بھاری ہدف ہے لیکن ہمیں پتہ ہے کہ امریکی سامراجیت کی مخالفت کرنے والوں کی طویل تاریخ موجود ہے۔ بہت سے دوسروں نے فلپائن پر قبضے کے دوران اینٹی امپیریلسٹ لیگ بنائی تھی۔ امریکہ کے اندر اس پالیسی کے مخالفین کی ایک لمبی روایت موجود ہے۔ دوسری دلیل بھی فضول ہے۔ جاری جنگ اور ایک عرب ملک پر تسلط یعنی مشرق وسطیٰ پر دوہرے قبضے کے ساتھ دنیا بہتر کیوں کر ہوگئی ہے۔ دنیا بہتر نہیں ہوئی زیادہ خطرناک ہوگئی ہے کیونکہ یہ جنگ دہشت گردی کو حوصلہ دے گی۔ جہاں تک صدام کا تعلق ہے تو جب اس کا جبر اپنے عروج پر تھا تو ڈونلڈ رمز فیلڈ نے ریگن کے خصوصی ایلچی کی حیثیت سے دسمبر 1983ء میں بغداد کا دورہ کیا تھا۔ جب وہ ایران کے ساتھ جنگ کے دوران بدترین مظالم ڈھا رہا تھا اور 1979ء میں کردوں کے خلاف کیمیائی حملے کر رہا تھا تو برطانیہ اور امریکہ دونوں نے اس کا ساتھ دیا۔ بائیں بازو والوں نے ان مظالم پر احتجاج کیا لیکن ہماری حکومتیں صدام کو مدد دیتی رہیں۔ امریکیوں کا یہ دعویٰ بے بنیاد ہے کہ حالات پہلے سے بہتر ہیں۔ آمروں یا ایرانی مذہبی حکمرانوں کو ہٹانے کا فیصلہ ان کے عوام کی طرف سے بہتر ہوگا۔ تبھی یہ تبدیلی نامیاتی ہوگی۔ بیرونی قوتوں کے ہٹانے پر صدام کو نئی زندگی ملی ہے۔ اس کی مقبولیت بڑھ رہی ہے۔ وہ بھاگا نہیں۔ عراقی اسے سخت ناپسند کرتے ہوں گے لیکن اب بہت سے اس کی عزت کرتے ہیں۔

آپ کی ایک کتاب کا اقتباس آج کے لیے نہایت موزوں ہے: ''پھر سیاست داں سستے جھوٹ ایجاد کریں گے۔ زیرحملہ قوم پر الزام دھریں گے اور ہر کوئی ضمیر کی ان تھپکیوں پر خوش ہوگا، ان کا مطالعہ کرے گا اور ان کے استرداد میں آنے والی ہر شے کو رد کر دے گا اور یوں رفتہ رفتہ خود بھی قائل ہو جائے گا کہ جنگ جائز ہے اور پھر خود فریبی کے اس عمل کے بعد سکھ کی نیند کے لیے خدا کا شکر کرے گا۔'' یہ کس نے لکھا؟

''امریکی اینٹی امپیریلسٹ لیگ'' کے بانیان میں سے ایک مارک ٹوین کے یہ الفاظ اس کی موت کے بعد 1916ء میں رسالے ''Harper'' میں چھپے تھے۔ میرا خیال ہے کہ اگر اس لیگ کا احیا ہوتا ہے تو اسے بڑی وسیع اور معاشرے کے ہر حلقے سے معاونت ملے گی۔ لیگ کو چاہیے کہ خود کو بائیں بازو تک محدود نہ رکھے بلکہ لوگوں کے متنوع حلقوں کو ساتھ لے کر

چلے۔ یہ دنیا بھر میں مقبول ہو سکتی ہے اور یقیناً ایک بڑی پیش رفت ہو گی۔

ارون دتی رائے نے ''War Talk'' میں لکھا: ''ہمارا لائحہ عمل ایمپائر کے خلاف صرف کھڑے ہونا نہیں بلکہ اس کا محاصرہ کرنا ہے تا کہ یہ آکسیجن سے محروم ہو جائے۔'' ہم ایک ایمپائر کو آکسیجن سے کیوں کر محروم کر سکتے ہیں؟

ہمیں درپیش چیلنج کو حقیر نہیں جاننا چاہیے۔ تاریخ میں پہلی بار دنیا میں صرف ایک ایمپائر موجود ہے اور اس کے ساتھ لڑنا آسان نہیں ہو گا۔ اسے فوجی شکست نہیں دی جا سکتی۔ اسے توڑا جا سکتا ہے اور اس کا محاصرہ بھی ہو سکتا ہے لیکن کوشش کا بڑا حصہ خود امریکہ کے اندر ہونا ضروری ہے۔ یعنی یہ محاصرہ جمہوری ہونا چاہیے۔ میں ریاست ہائے متحدہ میں بہت گھومتا ہوں اور بہت سے لوگ صرف انفارمیشن کے لیے مجھے سنتے ہیں۔ مینا پولس میں ایک شخص مجھ سے پوچھتا ہے کہ آیا اسرائیل کے پاس واقعی نیوکلیائی و کیمیائی ہتھیار موجود ہیں تو پھر ہمارا صدر ہمیں بتاتا کیوں نہیں؟ آپ سے تو اس طرح کے سوال کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ میں متواتر حیران ہوتا ہوں کہ امریکہ میں انفارمیشن کی کیسی قلت ہے۔

آپ نے "Bush in Babylon" میں انتونیو گرامچی کے اس جملہ کا حوالہ دیا تھا کہ ''' معمولاً اجارہ داری کے عمل میں قوت اور رضامندی کا امتزاج ملتا ہے۔ اگرچہ ان کی مقدار بدلتی رہتی ہے لیکن بالعموم قوت کو رضامندی پر بہت زیادہ غلبہ نہیں دیا جاتا۔'' آپ کو گرامچی نے کیوں اتنا متوجہ کیا؟

اس لیے کہ گرامچی وہ نظریہ ساز ہے جس نے اس امر پر غور کیا کہ سرمایہ داری دنیا پر حاکم کیوں ہو گئی ہے۔ جبکہ دیگر نظریہ ساز فقط یہی اصرار کرتے ہیں کہ سرمایہ داری نے یہ کام قوت کے بل بوتے پر کیا ہے۔ اگر سرمایہ داری نظام کا کنٹرول فقط قوت سے ہوتا تو یہ اتنا لمبا عرصہ نہ چلتا۔ محکوم کی رضامندی کے بغیر نظام کو جاری رکھنا مشکل ہوتا ہے۔ اب یہ بات زیادہ واضح ہے لیکن جب بیس کے عشرے میں گرامچی نے کہی تو اس پر زبردست بحث ہوئی تھی۔

ہندوستان پر برطانوی تسلط کے پورے دورانیہ میں جنگ عظیم دوم کو چھوڑ کر کبھی چھتیس ہزار سے زیادہ برطانوی سپاہی یہاں تعینات نہ تھے۔ اتنی تھوڑی سی نفری کے ساتھ انہوں نے پورے برصغیر کو کیسے قابو کیے رکھا۔ فقط اس طرح کہ انہیں یہاں کی حکمران جماعت کی معاونت

MashalBooks.com

حاصل تھی۔ جونہی یہ معاونت ختم ہونا شروع ہوگئی برطانوی حکومت کا خاتمہ ممکن ہوگیا۔ یہی وجہ ہے کہ برطانیہ نے یہاں کسی کو تعلیم نہ دی۔ انہیں پتہ تھا کہ اگر آبادی کے بڑے حصے کو تعلیم یافتہ کیا گیا تو تماشا بہت پہلے ختم ہو جائے گا۔ برطانیہ ہندوستان سے گیا تو یہاں کی پچاسی فیصد آبادی دیہی اور نوے فیصد ناخواندہ تھی۔گرامچی کو پڑھنے سے مجھے پتہ چلا کہ اس طرح کی رضامندی کیسے بنائی جاتی ہے۔ ریاست ہائے متحدہ نے بھی، مثال کے طور پر لاطینی امریکہ میں، یہی حربے آزمائے ہیں۔

گرامچی کی ایک اور بات بھی ان دنوں نہایت موزوں لگتی ہے: ''جب قوت مؤثر رہے اور نہ ہی رضامندی تو اکثر دولت میدان میں آتی ہے اور لوگوں کو خرید لیا جاتا ہے۔ اگر آپ سلامتی کونسل میں قراردادوں کے منظور ہونے کا سلسلہ دیکھیں تو آپ کو ترغیب وتحریص اور دھونس دھاندلی دونوں کا آمیزہ نظر آئے گا۔ ریاستوں سے وعدہ کیا جاتا ہے کہ اگر وہ اپنا ووٹ ان کے حسب خواہش استعمال کریں گے تو انہیں امداد دی جائے گی۔ 1948 میں اسرائیل کو اسی طرح منظور کروایا گیا۔ گرامچی جسے اٹلی میں مسولینی کے دورِحکومت میں مقدمہ چلا کر جیل بھجوا دیا گیا تھا نظام میں اس طرح کے رخنوں کی بات کی ہے جنہیں استعمال کرتے ہوئے حزب اختلاف اپنی توانائی بروئے کار لاسکتی ہے۔لیکن اس کے مقابل نظام مونولتھک (Monolithic) نہیں تھا۔ ریاست ہائے متحدہ یا یورپ میں رخنے موجود ہیں۔ مثال کے طور پر مائیکل مور انہیں استعمال کرنے کا ماہر ہے۔

اس وقت ایمپائر میں تین جگہ رخنے موجود ہیں اور سب سے بڑا لاطینی امریکہ میں۔ یہ اس دنیا کا حصہ ہے جہاں منرو ڈاکٹرائن کے بعد سے ریاست ہائے متحدہ کا تسلط ہے۔ امریکی میرین کے جنرل سمڈلے بٹلر نے اس موضوع پر بڑی چشم کشا کتاب "War is a Rackit" لکھی۔ وہ بیان کرتا ہے کہ کس طرح امریکی میرین دستوں کو مافیا کے انداز میں استعمال کرتے ہوئے لاطینی امریکہ پر کارپوریشنیں مسلط کی گئیں۔ یہ کتاب ایک جنرل نے لکھی ہے جس کے پاس ریٹائرڈ ہونے کے بعد غور وفکر کا وقت تھا۔ میں ایک طرف سمڈلے بٹلر اور دوسری طرف مارک ٹوین کا حوالہ دیتے ہوئے واضح کروں گا کہ ریاست ہائے متحدہ میں انحراف موجود ہے اور ہمیں اسے بنیاد بنانا ہوگا۔ یہ بات بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ آج لاطینی امریکہ کے بہت بڑے حصوں نے بغاوت شروع کر دی ہے۔ انہیں اپنی بات پھیلانے کے لیے متبادلات پیش کرنا ہوں گے۔ اور اگر معمولی سے متبادلات بھی لاطینی امریکہ میں اس

طرح کارگر ہونے لگے جیسے وینزویلا میں ہو رہے ہیں تو ایمپائر کی اقتصادی پالیسیوں کو زک پہنچے گی۔

دوسرا بڑا رخنہ عرب مشرق میں موجود ہے۔ یہ تیل کی وجہ سے اہم ہے۔ اس خطہ میں دہرا تسلط موجود ہے۔ فلسطین پر اسرائیل اور عراق پر ریاست ہائے متحدہ اور برطانیہ کا قبضہ ہے۔ اس مسئلے کا حل خاصا مشکل ہے۔

تیسرا رخنہ افغانستان میں ہے۔ امریکی افغانستان میں تھک چکے ہیں۔ لگتا ہے کہ وہ ایک کٹھ پتلی حکومت کی آڑ میں وہاں سے نکلنے پر مجبور ہو جائیں گے اور ان کے نکلتے ہی انتشار غالب آ جائے گا۔

جب یہ رخنے کھلنے لگیں گے تو ہمیں امید ہو گی کہ ایک فیصلہ کن عنصر یعنی یہ اندرون ملک چیلنج سامنے آئے گا۔ ریاست ہائے متحدہ کے قلب میں یہ چیلنج تمدنی، سیاسی اور سماجی مختلف سطحوں پر ابھرے گا اور بالآخر حکومتی سیاست میں داخل ہو جائے گا۔ معاملات فقط نچلی سطح پر نہیں بدلے جا سکتے۔ نچلی سطح پر اٹھنے والی تحریک کا اثر اوپر تک پہنچنا ضروری ہے۔ یعنی کہ ایسے لوگ ضروری ہیں جو اس جذبے کو آواز دے سکیں۔ جارج میک گورن کے ناکام صدارتی انتخاب کے بعد سے کسی نے یہ کام نہیں کیا۔

ایڈورڈ سعید کو گرامچی کا یہ فقرہ بہت پسند تھا، ''دانش کا انفعال، ارادے کی رجائیت۔'' اس نے آپ کو بھی متاثر کیا؟

گرامچی نے یہ فقرہ رومین رولینڈ سے مستعار لیا، لیکن میں اس سے متاثر ہوں۔ ہمیں اپنے حواس میں رہتے ہوئے حقیقت پسند رہنا ہو گا۔ ماضی میں بڑی تخیلی سیاست ہو گئی۔ ساٹھ کا عشرہ بڑا اچھا زمانہ تھا اور جو کچھ کیا مجھے اس پر کوئی پچھتاوا نہیں۔ لیکن وہ خاصا پاگل پن بھی تھا۔ "The Black Panthers" اور "The Weather Underground" سمجھتے تھے کہ ایمپائر کو چیلنج کرتے ہوئے بزور طاقت جیتا جا سکتا ہے۔ یہ بڑا پاگل پن تھا۔ جب تک آپ اکثریت کو ساتھ نہیں، ملاتے جیت نہیں سکتے۔ آبادی کا قابل ذکر حصہ آپ کے ساتھ ہونا چاہیے۔ ہمیں لوگوں کی رضامندی کو اپنی طرف کرنا ہو گا اور یہی کلید ہے ورنہ ہم ہاریں گے۔ اگر یہ حکمت عملی ہمارے خلاف بھی جاتی ہے تو ہمیں لوگوں کو سچ بتانا ہو گا۔ ہم جھوٹی امیدیں نہیں دلا سکتے۔ سرمایہ داری آج نہیں تڑخے گی اور اس میں بہت لمبا وقت لگ

MashalBooks.com

سکتا ہے۔ جب تک اس کا متبادل نہیں ملتا یہ غائب نہیں ہوگی۔ 1917ء سے 1989ء تک نظر آنے والا متبادل؛ کمیونزم کا باطل ظہور تھا۔

ہمارے پاس موجود نظام ریاست ہائے متحدہ یا کسی بھی اور جگہ اکثریت کی ضروریات پوری نہیں کرتا لیکن جلد یا بدیر متبادلات سامنے آئیں گے۔ ہمیں صبر سے انتظار کرنا ہوگا۔

MashalBooks.com

5

پاکستان ـــــ جنرلوں کی حکومت

آپ نے "New Left Review" میں چھپنے والے اپنے مضمون "The Color Khaki" میں اپنے وطن کی بات کی ہے۔ اور اسے جاں نثاری پاکستان کا نام دیا ہے۔ اس مضمون کا موضوع ایک ایسے ملک کی سیاست ہے جسے 1947ء میں برطانوی ہند سے کاٹ کر بنایا گیا۔ آپ کے اس مضمون کے اہم نکات کیا ہیں۔

لفظ جاں نثاری عثمانیہ سلطنت کے حوالے سے استعمال ہوتا ہے۔ یہ فوج عثمانیوں نے بنائی تھی۔ یہ لفظ کے بہت درست معنوں میں کرائے کی فوج نہیں تھی۔ عثمانیوں نے اسے علاقہ جات پر قبضہ کے لیے استعمال کیا اور دنیا کے وسیع علاقے قبھائے۔ اس فوج کی نمایاں خاصیت یہ تھی کہ اس کا غالب حصہ غیر ترک لوگوں پر مشتمل تھا۔ چنانچہ جب میں نے جاں نثاری (Janissary) پاکستان کی بات کی تھی تو میرا مطلب یہ تھا کہ پاکستان اس وقت دنیا کی واحد موجود سپر پاور کے لیے ترک جاں نثاروں کا کردار ادا کر رہا ہے۔ یعنی یہ وہ فوج ہے جو امریکی امپائر کے لیے کام کر رہی ہے۔ کئی لڑکے جو میرے ساتھ سکول میں تھے بعد ازاں فوج میں اعلیٰ عہدیدار بنے۔ میں ان سے مذاقاً کہا کرتا ہوں: ''جب امریکہ کو سیکولر آمر کی ضرورت ہوتی ہے ہم مہیا کرتے ہیں۔ جب اسے اسلام پسند آمر کی ضرورت ہوتی ہے ہم مہیا کرتے ہیں۔ اور اگر کسی دن انہوں نے دو نسلے آمر کی فرمائش کی تو مجھے یقین ہے کہ ہم وہ بھی مہیا کر دیں گے۔ جنرل وہ بھی ڈھونڈ نکالیں گے اور کہیں گے جناب عالی! حاضر ہے۔ یہ دو نسلا ہے اور آپ کے لیے ملک چلا سکتا ہے۔''

میں نے اس مضمون کو ''The Color Khaki'' کا نام دیا تھا۔ فوجی وردی کا یہ

MasalBooks.com

بھورا سبز رنگ آج ہر طرح سے پاکستان پر غالب ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ فوج برطانوی امپائر کے وارثوں میں سے ایک ہے۔ برطانیہ نے ہمیں بہت کچھ نہیں دیا لیکن جاتے ہوئے ایک فوج، ایک سول سروس اور ایک ریلوے نیٹ ورک ضرور دیا ہے۔ اور یہ کسی نہ کسی حد تک آج بھی فعال ہیں۔ 1947ء میں بننے والے پاکستان میں قومی تحریک بہت کمزور تھی۔ امپائر کے دنوں میں پاکستان کے سب سے بڑے صوبے پنجاب پر لینڈ لارڈوں کے ذریعے حکومت کی جاتی تھی۔ اور چونکہ برطانیہ کے جانے کے بعد بھی ان کی حکومت کا تسلسل جاری رہا لیکن ان کی حکومت اور کنٹرول دونوں کمزور ہوئے۔ چنانچہ فوج نے یہاں ایک برا کردار ادا کیا۔ اسی لیے پاکستان کی پیدائش کے فوراً بعد اس پر فوجی بیوروکریسی کمپلیکس کی حکومت آ گئی۔ سیاسی حکومت پر سول سرونٹس کا غلبہ تھا اور جونہی سیاست قابو سے باہر ہوتی فوج اس پر قبضہ کے لیے تیار ملتی۔

پاکستان میں فوج پہلی بار 1958ء میں اقتدار میں آئی اور اس کا مقصد اپریل 1959ء کے انتخابات کے حوالے سے حفظ ماتقدم تدبیر کرنا تھا۔ ریاست ہائے متحدہ کو خدشہ تھا کہ انتخابات ہوئے تو قوم پرست جماعتیں جیت جائیں گی اور امریکہ کے ساتھ پاکستان کے سلامتی کے معاہدے توڑ دیں گی۔ اور وہ جماعتیں واقعی یہ کر گزری ہوتیں۔ چنانچہ امریکہ نے ایک فوجی انقلاب کا انتظام کیا۔ اس کے بعد سے یہی ہوتا چلا آ رہا ہے: فوجی آمریت، ایک سیاسی حکومت جو وعدے بہت کرتی اور عمل درآمد بہت کم، ایک بار فوجی آمریت، اور اگلی سول حکومت۔ اس ملک کی زندگی کا ایک بڑا حصہ فوجی آمریت میں گزرا۔ منتخب حکومتوں نے یہ ملک پندرہ سال چلایا، بے شمار بیوروکریٹ اور ان کے سدھائے ہوئے فرنٹ مین گیارہ برس حکومت میں رہے جبکہ فوج نے انتیس برس حکومت کی۔ ہمارے موجودہ آمر جنرل پرویز مشرف غیر ملکی دوروں پر سوٹ اور ٹائی پہنتے ہیں لیکن ملک میں ان کی واحد بنیاد فوج کے کمانڈر انچیف کا عہدہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ ان کے ساتھ معاملات کرتا ہے۔ انہوں نے پاکستان میں ہمیشہ فوج کے ساتھ معاملہ کرنے کو ترجیح دی ہے کیونکہ وہ اسے اچھی طرح جانتے ہیں۔ فوج کے بہت سارے افسروں نے فورٹ بریگ اور دیگر امریکی اداروں میں تربیت لی اور امریکی ان کے ساتھ معاملات طے کرنے میں آسانی محسوس کرتے ہیں۔ جبکہ سیاست دانوں کے ساتھ معاملہ کرنا مشکل ہوتا ہے۔

لاطینی امریکہ اور مشرق وسطیٰ میں موجود ممالک کے مابین ایک تاریخی مماثلت موجود ہے جس کا حوالہ امریکہ اور فوج کا تعلق ہے۔

لاطینی امریکہ میں آمریت، اور بالخصوص جو سرد جنگ کے دوران مسلط کی گئی، نے ان ملکوں کو امریکی حلیف بنائے رکھا۔ پاکستان میں یہ کام فوج نے کیا۔ سرد جنگ کے اواخر میں بعض شکوک پیدا ہو چکے تھے کیونکہ امریکہ پاکستان اور افغانستان میں دلچسپی کھو بیٹھا تھا۔ روس کی شکست کے بعد امریکہ نے 11 ستمبر 2001ء تک اس خطے کو کوئی خاص وقعت نہ دی۔ وہ طالبان کے ساتھ بھی بات چیت کرتے رہے لیکن اسے پاکستان یا اس کے مسائل میں کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ پاکستانی فوج کے ایک حصے کو جس نے زیادہ تر افغانستان میں روسیوں کے خلاف امریکہ کا ساتھ دیا تھا اس طرح نظر انداز کیے جانے پر بہت برا مانا۔

ہمیں نہیں بھولنا چاہیے کہ کارٹر کے قومی سلامتی کے مشیر Zbigniew Brzezinski نے پاک افغان سرحد پر کھڑے ہو کر ایک باریش ہجوم سے کہا تھا، ''جاؤ اور روسی کافروں کے خلاف لڑو۔ جاؤ اور جہاد کرو۔ خدا تمہارے ساتھ ہے۔'' پاکستان کے لوگوں کو یہ سب یاد ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے امریکیوں کا ساتھ دیا اور افغانستان کو چھڑا لیا۔ اور پھر امریکہ نے ہمیں ایک طرف ڈال دیا۔ یوں ظالمانہ طور پر نظر انداز کیے جانے پر لوگوں کو صدمہ ہوا۔ اس لیے کہ لوگوں کو واقعی فریب دیا گیا تھا کہ امریکہ ان کے ساتھ ہے۔

روس اور افغانوں کے درمیان ہونے والی جنگ کے زمانے میں ہی پاکستان کے اسلام پسندوں نے خود کو مسلح کیا۔ اس سے پہلے کبھی یہ لوگ مسلح نہیں ہوئے تھے۔ ملک میں پیسہ اور اسلحہ وافر ہوا اور اسلام پسند اداروں کے لیے خطرہ بننے لگے۔ لوگ بڑی تعداد میں مارے گئے۔ پھر سنی بنیاد پرست گروپ ابھرے۔ انہوں نے کافر قرار دے کر شیعہ ہلاک کرنا شروع کیے۔ پھر شیعہ منظم ہونے لگے۔ ملک بھر میں فرقہ وارانہ فسادات کئی سال تک ہوتے رہے۔ یہ جنرل ضیا کے عہد حکومت کا ورثہ ہے جس نے قوم کے سیاسی کلچر اور سیاسی زندگی کو معطل کر کے رکھ دیا۔ ہم ابھی تک اس کی قیمت دے رہے ہیں۔

> یہاں میں نوے کے عشرے میں دیا گیا برزنسکی کا ایک بیان دہراؤں گا: ''جب واضح نظر آنے لگا کہ مجاہدین میں سے کچھ عناصر جنہیں امریکہ نے بڑی گرم جوشی سے حلقہ بگوش کیا تھا اور جنہیں امریکی اور پاکستانی فوج نے تربیت دی تھی، طالبان بننے لگے ہیں تو اس نے بڑے خطیبانہ انداز میں کہا، ''سوویت یونین کے انہدام کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہ ''چند ایک انتہا پسند مسلمان'' کیا ہیں؟''

اس سے پتہ چلتا ہے کہ اسے ان مسلمانوں سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ انہی مسلمانوں نے بالآخر نیویارک اور پینٹا گون پر حملہ کیا۔ اس معاملے میں کسی نے بھی برزنسکی کو کبھی چیلنج نہیں کیا۔ اس کی مذمت میں نیویارک ٹائمز میں کبھی کوئی اداریہ نہیں چھپا۔ امریکہ خارجہ پالیسی میں یہ عمل بار بار ہوتا آیا ہے۔ جب کسی بھی ایرے غیرے نتھو خیرے کے ساتھ حلیف بننا مفاد میں ہوتا ہے تو وہ اپنے یا باقی دنیا کے حق میں نتائج وعواقب کی پروا کیے بغیر یہ کام کر گزرتے ہیں۔

آیئے پاکستان کے معرض وجود میں آنے پر بات کرتے ہیں۔ یہ دنیا کے بڑے مسلم ممالک میں سے ہے اور اس کی آبادی لگ بھگ پندرہ کروڑ ہے۔ آزادی کے حوالے سے علامہ محمد اقبال اور محمد علی جناح کلیدی شخصیتیں ہیں۔ ہم بات کا آغاز اقبال سے کرتے ہیں۔ وہ 1873ء میں پیدا ہوئے اور 1938ء میں وفات پا گئے۔ وہ اہم کیوں تھے اور انہوں نے جنوبی ایشیا میں مسلم شعور کی تشکیل میں کیا کردار ادا کیا۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں مزید پیچھے مغل سلطنت تک جانا ہوگا جو سولھویں سے اٹھارھویں صدی تک قائم رہی۔ مغل حکومت کے سینکڑوں برسوں نے یہاں ایک حکمران طبقہ پیدا کیا۔ یہ طبقہ بڑی حد تک ملا جلا تھا۔ لیکن یقیناً حکمران طبقہ مسلمان تھا۔ ان مسلمان بادشاہوں نے ہندو اور پھر سکھ بالائی طبقے کے ساتھ مل کر حکومت کی۔ حتیٰ کہ اورنگزیب جیسے ظاہر دار مسلمان بادشاہ کی فوج کے سارے جنرل ہندو تھے۔ اورنگ زیب کی مذہبی پالیسی کی وجہ سے نہیں بلکہ ذات پات کے امتیاز کی وجہ سے بہت سے ہندو مسلمان ہو گئے۔

مسلمان ہونے کے بعد سب برابر ہو جاتے ہیں اور اسلام میں طبقے یا رنگ کا کوئی فرق موجود نہیں رہتا۔ یوں بہت سے لوگ مسلمان ہوئے اور اس طرح اسلام ہمیشہ اقلیت میں ہونے کے باوجود ہندوستان کے اندر ایک بڑی قوت بن گیا۔

برطانیہ کی آمد اور مغل سلطنت کی تباہی نے خوش نویسوں، خطاطوں اور معماروں سمیت لوگوں کی ایک بڑی تعداد کو تباہ کر دیا جو دربار کے ساتھ وابستہ تھی۔ مسلم اشرافیہ پر بھی منفی اثر پڑا۔ دھیرے دھیرے اس خیال نے جڑ پکڑی کہ مسلمانوں کو بے دخل کیا جا رہا ہے۔ برطانیہ نے بھی ان کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا اور یوں بغاوت نے جنم لیا۔ 1857ء میں ہونے والی اس پہلی بغاوت کو غدر (Mutiny) کا نام دیا گیا جو کامیابی کے بہت قریب جا پہنچی تھی۔ ہندوستان کے بعض حصوں میں انگریزوں کو شکست ہوئی لیکن برطانوی ٹیکنالوجی اور مقامی حکمران جماعت کو ساتھ ملانے میں کامیابی کی بدولت بالآخر انہوں نے یہ جنگ جیت

MashalBooks.com

لی۔اس نے بھی مسلم ہندوستان پر گہرے اثرات چھوڑے۔

دھیرے دھیرے برصغیر کے مسلمانوں کے کچھ دھاروں نے جدت اپنائی اور کچھ سیکھنے کے لیے مغرب سے رجوع کیا۔ان میں سے ایک سر سید احمد خاں تھے۔اقبال جن کا آپ نے پوچھا ہے برصغیر پاک و ہند کے بڑے شاعروں میں سے ایک تھے۔ابتدا میں اقبال بھی ہندو، مسلم، سکھ اور بدھ امتزاجی قومیت کے قائل تھے جس کی بنیاد پر وہ ہندوستان کو آزاد کروانا چاہتے تھے۔ ہندوستان کا قومی ترانہ ''ترانہ ہندی'' انہوں نے لکھا۔آج بھی یہ ہندوستان میں گایا جاتا ہے کیونکہ قوم پرست تحریک نے اسے قومی ترانہ بنالیا تھا۔ جب مہاتما گاندھی نے اپنی تمام تر شخصی عظمت کے باوصف ہندوعوام کو جگانے کے لیے ہندوامیجری کو بکثرت برتنا شروع کیا تو اقبال اور بعض دیگر لوگ پریشان ہو گئے۔ اقبال اور پاکستان کے بانی محمد علی جناح سمیت مسلمانوں کے ایک گروپ نے اس پر سخت ردعمل کا اظہار کیا۔ان کا کہنا تھا کہ ''اس میں سے کوئی شے پہلے موجودنہیں تھی تو گاندھی رام راج اور اسی طرح کے حوالے کیوں دے رہا ہے؟'' اچانک انہیں پتہ چلا کہ امپائر نے ان دو کمیونٹیوں کے درمیان مسابقت پیدا کر دی ہے۔1906 میں مسلم لیگ قائم ہوئی جس میں انگریزوں کی پہل قدمی بھی شامل تھی۔مسلم لیگ کی اساسی دستاویز میں درج ہے کہ ہم ہندوستان کے ممتاز مسلمان حکمران، تعلقہ دار اور جاگیردار برطانوی امپائر کے ساتھ وفاداری کو تقویت دینے کے لیے یہ تنظیم تشکیل دے رہے ہیں۔ یہ مسلم لیگ کا اساسی نقطۂ نظر تھا اور اسے قومیت پرستی کے مقابل کھڑا کیا گیا تھا۔ پٹیل کا تو ذکر ہی کیا گاندھی اور نہرو نے بھی مسلمانوں کو لاتعلق کرنے میں بڑا کردار ادا کیا حالانکہ انہیں ساتھ رکھا جا سکتا تھا۔ اس صورت میں انہیں مراعات دینا پڑتیں۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ اقبال نے ہندوستان میں مسلم قوم کا تصور متشکل کیا۔ان کا نظریہ تھا کہ ہم دو قومیں ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ داخلی طبقاتی تقسیم سے بھی آگاہ تھے۔ بطور شاعر اقبال کے سر سہرا بندھتا ہے کہ ہندو مسلم کشاکش کے باوجود وہ کبھی نہ بھول پائے کہ ہندوستان میں حقیقی طبقاتی تفریق کاشت کار اور زمیندار کی ہے۔انہیں کاشت کار کی دگرگوں حالت نے سخت متاثر کیا اور اس حوالے سے ایک خوبصورت نظم ''لینن بحضور خدا'' بھی لکھی تھی۔ وہ دکھاتے ہیں کہ لینن مرنے کے بعد آسمانوں پر خدا کے سامنے کھڑا ہے۔ خدا اسے کہتا ہے کہ ''یہ تم نے زمین پر اتنی ہڑبونگ کیوں مچا رکھی تھی؟'' جواباً لینن خدا کو انسانی ابتلاؤں کا حال بتاتا ہے۔ تب خدا موقر ترین فرشتے جبرئیل کو حکم دیتا ہے:

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

اقبال کے یہ شعر ترقی پسندوں میں بہت مقبول ہوئے۔ جلسوں میں پڑھے جاتے تو لوگوں کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ یہی شاعر تھا جس نے کہا کہ مسلمانوں کے لیے ایک الگ وطن کی ضرورت ہے۔ ابتدا میں مسلم عوام اس حوالے سے کچھ زیادہ پرجوش نہ تھے۔ مسلم اکثریت کے ہندوستانی علاقہ جات میں بھی پاکستان کی کچھ زیادہ پذیرائی نہ ہوئی۔ اسے زیادہ تر حمایت سی پی اور یو پی جیسے ان علاقوں سے ملی جہاں مسلمان اقلیت میں تھے اور جہاں کے زمینداروں اور دانشوروں کو ڈر تھا کہ آزادی کے بعد ان پر ہندو اکثریت غالب آ جائے گی۔ وہ یہ ادراک نہ کر پائے کہ اگر بڑی مسلم ریاستیں ہندوستانی فیڈریشن کا حصہ بنتی ہیں تو ہندو کا غلبہ نہیں ہوگا۔

پاکستان بننے کا تعلق ہندوستانی مسلمانوں کی حقیقی ضروریات سے کم اور جنگ عظیم دوم سے زیادہ تھا۔ جنگ کے دوران گاندھی بے صبرا ہو گیا۔ سنگاپور پر قبضہ ہوا تو اس نے سوچا کہ برطانوی امپائر ختم ہوئی اور اب جاپانی آنے والے ہیں۔ چنانچہ اس نے ایک تحریک چلانا ضروری سمجھی تاکہ جاپانیوں کے ساتھ گفت و شنید کی سطح پر آنے کے لیے ضروری قوت حاصل کر سکے۔ چنانچہ گاندھی نے 1942ء کی ''ہندوستان چھوڑ دو'' تحریک چلائی۔ برطانوی ہکا بکا رہ گئے۔ کیونکہ اس سے پہلے ہندوستانی اپنے فاتحین کے ساتھ بات چیت کر رہے تھے۔ نہرو کی پوزیشن بڑی دلچسپ تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ جنگ عظیم دوم میں ہندوستان اتحادیوں کا دفاع کرے گا کیونکہ ان کا دشمن فاشزم ہے۔ لیکن اس امر کے فیصلہ کا حق صرف آزاد ہند کو حاصل ہے۔ بصورت دیگر یہ مسلط کیا گیا فیصلہ ہوگا۔ نہرو کہتا تھا کہ ''اگر تم اب نکل جاتے ہو اور ہندوستان کو آزاد کر دیتے ہو تو آزاد ہندوستان جنگ میں تمہاری مدد کا فیصلہ کرے گا۔'' تاہم برطانوی اس کے لیے تیار نہیں تھے۔ وہ نجی محفلوں میں کہتے کہ ''جونہی جنگ ختم ہوئی تمہیں آزادی مل جائے گی لیکن اب ہماری مدد کرو۔'' گاندھی نے بڑی ہٹ دھرمی سے انکار کر دیا۔

''ہندوستان چھوڑ دو'' تحریک سے ذرا پہلے انگریزوں نے گاندھی کے پاس ایک بڑا وفد بھیجا۔ 1942ء میں سر سٹیفورڈ کرپس اور ممتاز برطانوی ترقی پسندوں نے گاندھی سے ملاقات

MashalBooks.com

کی اور جنگ کے بعد ہر چیز کا وعدہ کیا۔ اس نے سودے بازی سے انکار کر دیا۔ جب کرپس نے گاندھی سے کہا کہ ''برطانیہ اسے بلینک چیک دے رہا ہے،'' تو گاندھی نے جواباً کہا، ''ڈوبتے بینک کا بلینک چیک دینے کا کیا فائدہ؟'' بالفاظ دیگر گاندھی صورتحال کا ادراک نہ کر سکا۔ اور بہت سے لوگوں کے اندازے غلط ثابت ہوئے۔

یہی زمانہ تھا جب جنگی معاونت کے لیے مسلم لیگ کو برتا گیا۔ مسلم لیگ نے لوگوں کو ابھارنا شروع کیا اور انہیں بتایا کہ اگر وہ جنگ لڑتے ہیں تو برطانیہ ان کا مشکور ہوگا۔ ایک بات جس پر زیادہ تر مؤرخین نے بات نہیں کی یہ ہے کہ جنگ عظیم دوم کے دوران مسلم لیگ اور انگریزوں کا یہ سودا برطانوی ایمپائر کے نہایت فیصلہ کن دور میں ہوا تھا۔ اور یوں وہ مسلمانوں کو کرم خوردہ، اعضا بریدہ ریاست دینے پر مجبور ہو گئے۔ یاد رکھنے کی بات ہے کہ تقسیم سے ایک سال پہلے 1946ء تک جناح کنفیڈریشن جیسے حل کے لیے تیار تھے۔ بشرطیکہ (خفیہ اظہار کے مطابق) انہیں وزیراعظم بنایا جائے۔ اس پر نہرو کو اعتراض تھا۔ جناح ان دنوں علیل تھے۔ اس مقام پر گاندھی نے بڑی ہوشیاری سے کہا کہ ''جناح کو وزیراعظم بننے دو۔ اس کی بات مان لو۔'' نہرو اور پٹیل نے کہا، ''نہیں۔ ہم یہ کیسے مانیں؟ اس قدر چھوٹا پن!'' اور بالآخر تنگ نظری غالب آ گئی۔ اگرچہ پاکستانی مؤرخین ماننے سے ہچکچاتے ہیں لیکن حقیقت یہی ہے کہ 1946ء میں جناح اس طرح کے فیصلے پر تیار تھے کیونکہ انہیں حالات کا علم تھا۔

شمال مغربی سرحدی صوبہ کو لیجئے۔ اسی فیصد آبادی نے کانگرسی رہنما غفار خاں کو ووٹ دیئے۔ غالب مسلم آبادی کا یہ صوبہ 1946ء تک کانگریس کو ووٹ دیتا رہا۔ 1946ء کے بعد مسلم لیگ نے دھونس دھاندلی اور تشدد سے ان ووٹوں کا رخ بدلا۔ پشاور کے ایک بازار میں لوگوں کو دوسری طرف موڑنے کے لیے ہونے والے قتل عام کا ایک واقعہ بہت مشہور ہوا۔ پاکستان کو عوامی حمایت میسر نہیں تھی۔ یہ ریاست بالا بالا بنائی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ 1947ء کے بعد سے اب تک پاکستان کا بالائی طبقہ ہندوستان کے متعلق ایک بڑے احساس کمتری کا شکار چلا آ رہا ہے۔ ان کا انداز نظر ہر صورت میں یہی ہونا تھا۔ 1948ء میں بننے والے اسرائیل کی طرح جو اوپر کی سطح پر بننے والی ایک اور ریاست ہے اور جس پر عرب دنیا سوار رہتی ہے اور وہ اس کے علاوہ کچھ سوچ بھی نہیں سکتا۔ ہمارا ظالم ترین فوجی آمر ہر وقت اسرائیل اور پاکستان کا تقابل کیا کرتا تھا۔ وہ کہتا تھا، ''اسرائیل کی طرح ہم بھی سخت جاں ریاست ہیں اور ہم بھی عقائدی ریاست ہیں اور ہمیں بھی سخت کوش فوج بنانا ہوگی۔''

پاکستان نے پہلے روز سے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ ''اگر ہندوستان کسی چیز کی حمایت کرتا ہے تو ہم نہیں کریں گے۔'' انہوں نے خود کو ممیّز رکھنے کے لیے یہ طرزِ عمل اختیار کیا۔ جب ہندوستان غیر جانبدار تھا اور جواہر لعل نہرو نے غیر جانبدار تحریک چلائی تو پاکستان نے 1951ء اور پھر 1953ء میں امریکہ کے ساتھ سلامتی کے معاہدے پر دستخط کر دیئے۔ امریکی گندم آئی تو اسے خوش آمدید کہنے والے جلوس کی قیادت پاکستانی وزیراعظم بوگرا نے کی۔ جلوس نے ''تھینک یو امریکہ'' کے بینر اٹھا رکھے تھے۔ سارا معاملہ اسی وقت شروع ہوا۔ بتدریج پاکستان پر برطانوی ایمپائر کی گرفت گھٹتی ہوئی ختم ہوئی اور امریکہ غالب آنے لگا۔ سعودی عرب اور دنیا کے بہت سے حصوں میں یہی کچھ ہوا اور بالآخر پاکستان امریکی طفیلی ریاست بن گیا۔

> ایک بار پھر جناح کا ذکر کرتے ہیں جو انگلینڈ کے تربیت یافتہ بیرسٹر تھے۔ وہ پاکستان کی قومی زبان اردو سمیت کوئی ہندوستانی زبان نہیں بول سکتے تھے۔ 1947ء میں وہ اس ملک کے پہلے سربراہ بنے۔ لیکن ایک سال بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ قدرے تھوڑا اور پیچھے چلتے ہیں اور وہاں سے سلسلہ جوڑتے ہیں جہاں آپ نے ہندو اصطلاحات کے احیا اور بھجن اور سبزی خوری جیسے حربوں کا ذکر کیا تھا۔ بظاہر جناح نے جو خود کانگریس کے رکن تھے، گاندھی جی کو انتباہ کیا تھا اور ان کا یہ تبصرہ اکثر دہرایا جاتا ہے، ''مسٹر گاندھی! یہ سمت اختیار نہ کیجئے۔ مذہب کی طرف نہ جایئے کانگریس کو سیکولر رکھیے۔''

جناح بنیادی طور پر ایک سیکولر شخص تھے۔ انہیں لاادری کہا جا سکتا ہے۔ لیکن پھر جب وہ مسلم لیگ کے رہنما بن گئے تو ان کے لیے سرِعام یہ کہنا ممکن نہ رہا۔ اگرچہ آج پاکستان میں لوگ یہ سننا پسند نہیں کرتے لیکن ممبئی میں رہائش پذیر جناح جب کبھی لاہور آتے تو ہوٹل فلیٹیز میں ٹھہرتے جو ایک سی اونچائی پر بنے کشادہ کمروں کا کالونیل طرزِ تعمیر کا ہوٹل ہے۔ تب جناح خاصے معروف اور ممتاز وکیل تھے۔ لوگ پوچھتے کہ آپ دوستوں کے ہاں کیوں نہیں ٹھہرتے۔ سینکڑوں لوگ آپ کو خوش آمدید کہنے کو تیار ہیں۔ تب وہ کہتے کہ ''میں فلیٹیز میں اس لیے ٹھہرتا ہوں کہ یہاں بیکن اور انڈے بہت اچھے بنتے ہیں۔''

اسلام میں پورک کا کیا مقام ہے؟

اسلام میں پورک مکمل ممنوع ہے۔ یہ حرام ہے۔ اس مسلم قوم کا عظیم رہنما نہ صرف لاادری تھا بلکہ ہر طرح کے امتناع کا منکر۔ آپ نے یہ بھی سچ کہا کہ جناح صرف انگریزی جانتے تھے۔ وہ پنجابی، سندھی یا اردو میں سے کوئی زبان بھی نہیں جانتے تھے۔ حالانکہ خود میری پنجابی اچھی اور اردو بہت بری ہے لیکن جب میں نے جناح صاحب کی تقریروں کے ٹیپ سنے تو مجھے لگا کہ میں اس زبان کا ماہر ہوں۔ وہ اردو بولنے میں بہت اٹکتے تھے۔ یہ شخص ہی ایک اسلامی ریاست کا بانی ہے۔ یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ صیہونی ریاست کے رہنما ڈیوڈ بن گوریان اور موشے دایان بھی مذہبی نہیں تھے۔ چنانچہ یہودی ریاست اسرائیل اور مسلم ریاست پاکستان دونوں سیکولر سیاست دانوں کی تخلیق ہیں کیونکہ ان کی اپنی ضرورت کا تقاضا یہی تھا۔

اگر کانگرس ہندو امیجری کا استعمال شروع نہ کرتی تو جناح بخوشی اس جماعت کے رکن رہتے۔ لیکن کانگرس اس سے بھی آگے نکل گئی۔ کانگرس نے ہندو نعرے اپنائے تا کہ ہندوستانی عوام کو ابھارا جا سکے۔ گاندھی سمجھتا تھا کہ لوگوں کو ساتھ ملانے کا یہی ایک طریقہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ غلطی پر تھا لیکن اس نے سول نافرمانی کی تحریک کا آغاز اسی طرح کیا۔ جناح بنیادی طور پر طبقۂ بالا سے متعلق تھے اس امر نے بھی جناح کو پریشان کیا۔ وہ کہتے تھے کہ لوگوں کو جمہوریت ہم دیں گے۔ انہیں اس تحریک میں نچلی سطح کے لوگوں کی شمولیت خوش نہ آئی۔ انہیں عامۃ الناس کو تحریک میں شامل کرنے کا عمل بد ذوقی اور غیر ضروری لگتا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ برطانیہ کے ساتھ برابر کی سطح پر گفت وشنید کے ذریعے آزادی حاصل ہو جائے گی۔ انہیں کانگرس کی عوامی پیش رفت پسند نہ آئی۔ چنانچہ انہوں نے کانگرس سے استعفیٰ دے دیا۔ جناح جنہیں کبھی گاندھی ہندو مسلم اتحاد کا سفیر کہتا تھا بالآخر پاکستان کے بانی بن گئے۔

> عظیم شاعر اقبال آپ کے صوبہ پنجاب کے شہر سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ لیکن ان کا ایک حوالہ لاہور ہے اور وہ وہیں بادشاہی مسجد کے پہلو میں دفن ہیں۔ 1938ء میں انتقال سے پہلے انہوں نے اصطلاح پاکستان —— پنجاب، افغان، سندھ، کشمیر —— پیش کر دی تھی۔

میرا خیال ہے کہ لفظ ''پاکستان'' لندن میں مقیم ایک طالب علم رحمت علی نے وضع کیا

MashalBooks.com

جس نے حرف جوڑے اور اس اصطلاح پر پہنچا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ لفظ چل جائے گا کیونکہ یہ نہ صرف صوبوں کی علامت کا نمائندہ ہے بلکہ پاک کا مطلب صاف بھی ہے اور یوں پاکستان پاک لوگوں کا وطن ہے۔ تو معاملہ یوں تھا۔ 1938ء میں جب اقبال فوت ہوئے تو تمام لوگوں نے ان کا ماتم کیا۔ ان کا جنازہ بہت بڑا تھا۔

پاکستان اسرائیل کی طرح ہے۔ دونوں برطانیہ کے کنٹرول میں تھے اور دونوں ایک تقسیم کے نتیجے میں بنے جس نے ورثے میں موت، تباہی، بے گھری اور مہاجروں کا ایک انبوہ چھوڑا۔

محمود درویش، ایڈورڈ سعید اور دیگر قومی آوازوں کے سبب اسرائیل کی مثال تو بہت واضح ہے۔ یہاں میں صرف ایڈورڈ کا ذکر کروں گا جسے میں بہت عزیز جانتا تھا۔ اس کا عظیم ترین کارنامہ اس کا ادبی نظریہ نہیں بلکہ یہ ہے کہ اس نے فلسطین کو اپنا مقصد بنایا اور وہ اس بے گھر قوم کا وقائع نگار بنا۔ اس لیے اسے دنیا بھر میں عزت ملی۔ وہ فلسطینیوں کا واحد حقیقی مورخ ہے جس پر عرفات یا دیگر فلسطین رہنماؤں کی طرح بدعنوانی کے دھبے نہیں۔ اس نے فلسطینیوں کے مقصد کو زندہ رکھا اور واضح کیا کہ کیا ہوا ہے۔

جہاں تک تقسیم ہند کا تعلق ہے تو کم و بیش بیس لاکھ لوگ مرے۔ خاصی بڑی بحث ہوئی کہ دس لاکھ تھے یا بیس لاکھ۔ میں کہتا ہوں، ''مجھے پتہ نہیں۔ لیکن دس لاکھ ہوں یا بیس لاکھ، بہرحال اس سے صورتحال کی خرابی میں کوئی کمی نہیں آتی۔'' میں بیس لاکھ کہا کرتا ہوں کیونکہ بہت سے غریب لوگوں کی موت ریکارڈ پر نہیں آئی۔ انہیں اجتماعی قبروں میں دبا دیا گیا ہے۔ تقسیم کا شکار ہونے والوں کی کوئی ایک یادگار بھی نہیں بنائی گئی۔ پنجاب اور بنگال میں ہندو، مسلمان اور سکھ مارے گئے۔ ہندوستان اور نہ ہی پاکستان میں ان کی قربانی کا اعتراف کیا گیا۔

تقسیم کے متعلق بہت متاثر کن نظموں میں سے ایک نظم اٹھارہ سالہ سکھ لڑکی نے لکھی جسے لاہور چھوڑنا پڑا کیونکہ تقسیم ہو رہی تھی۔ اس نے قتل و غارت اور آتش زنی دیکھی تھی۔ اس کی یہ عظیم نظم ''ہیر رانجھا'' کے عظیم صوفی شاعر وارث شاہ کی یاد دلاتی ہے اور ہندوستانی اور پاکستانی پنجاب میں آج بھی گائی جاتی ہے۔ اٹھارویں صدی کے صوفی شاعر نے محبت کی اس داستان میں نسوانی کردار ہیر کی چیخ کو آواز دی ہے جسے جبراً ایک دوسری جگہ بیاہا جاتا ہے۔ اس نظم کا پہلا مصرع پنجابی کلچر پر حاوی ہو گیا: ''ڈولی چڑھدیاں ہیر نے'' اس اٹھارہ سالہ لڑکی نے اس نظم کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا:

اک روئی سی دھی پنجاب دی توں لکھ لکھ مارے وَین
اَج لکھاں دِھیاں روندیاں تے وارث شاہ نوں کہن
اُٹھ درد منداں دیا دردیا تک اپنا پنجاب
اَج بیلے لاشاں وِچھیاں تے لہو دی بھری چناب
اَج کتاب عشق دا کوئی اگلا وَرقہ پھول

تقسیم کو بیان کرنے والوں میں فیض احمد فیضؔ بھی شامل ہے جس نے تقسیم کے بعد اپنی ایک مشہور نظم لکھی:

یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

اگرچہ شاعروں نے اس المیے پر بہت کچھ لکھا لیکن تاریخ میں اس کی یاد محفوظ نہیں رکھی گئی۔ برطانوی ایمپائر نہ ہوتی تو اسرائیل بنتا اور نہ برصغیر تقسیم ہوتا۔ کون جانے اور کیا کیا فرق پڑتا؟ تاہم یہ دو ریاستیں تو بالکل نہ بن پاتیں جنہوں نے اس قدر ابتلا اور مسائل کو جنم دیا۔ لیکن اب یہ دونوں ریاستیں نیوکلیائی طاقت ہیں اور انہیں کوئی نہیں توڑ سکتا۔

> میرا تعلق آرمینیا سے ہے۔ میرا باپ 1915ء کی نسل کشی میں بھاگا اور میری ماں 1912ء میں بھاگ نکلی تھی۔ دونوں کی ملاقات 1921ء میں ہوئی اور وہ نیویارک میں بس گئے۔ لیکن اس پرانی دنیا کی یاد ہمیشہ ان کے ساتھ رہی۔ آرمینیا میں لوگ اسے اپنی زبان میں ریگیر (Yergeer) کہتے ہیں۔ یہ کم وبیش ایک جادوئی سی دنیا تھی۔ سالوں بعد جب میں ہندوستان گیا، وہاں ٹھہرا اور پھر پاکستان کا سفر بھی کیا تو میری ملاقات بہت سے لوگوں سے ہوئی۔ تب مجھے نہ صرف اپنے والدین یاد آئے بلکہ وہ رشتہ دار بھی جو نسل کشی سے بچ نکلے اور پھر ہمیشہ ریگیر کی آرزو کرتے رہے۔ مجھے مغربی پنجاب سے جا کر مشرقی پنجاب میں بسنے والے پنجابی ملے جو غالباً رومانویت کے تحت بتایا کرتے تھے کہ ان کے اطراف کا پانی کتنا صاف اور ہوا کتنی سبک تھی۔ یہ سب کچھ میرے اندر میرے وجود کے ساتھ ہم آہنگ تھا اور میرے پس منظر کے ساتھ وابستہ۔

MashalBooks.com

جب تقسیم ہوئی تو میں چار سال کا تھا۔ چنانچہ میری حقیقی یادیں نہیں ہیں۔ میرا خاندان اسی علاقے میں تھا جو پاکستان بنا۔ چنانچہ ہمیں نقل مکانی نہیں کرنا پڑی۔ البتہ مجھے یاد ہے کہ میں اپنے خاندان کے ساتھ کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا لاہور میں گھومتا رہتا تھا اور میرے والد میری ماں کو بتاتے تھے کہ برجندر یہاں رہتا تھا، یا پھر وہ کہتے تھے ''تمہیں یاد ہے اس گھر میں کون رہتا تھا؟'' چنانچہ مجھے اپنے والدین سے پتہ چلا کہ یہ سب کس پیمانے پر ہوا اور یہاں ہندوؤں اور سکھوں کے گھر بھی تھے اور یہ کہ ہم کثیر ثقافتی معاشرے سے محروم ہو گئے ہیں۔ تب پاکستان یک ثقافتی معاشرہ بن گیا تھا۔ اگرچہ لاہور اس وقت بھی خاصا بڑا شہر تھا لیکن میری نسل یہ نہ جان سکی کہ یہ سب کیسے ہوا۔ لوگ لاہور کو مشرق کا پیرس کہا کرتے تھے۔ یعنی ایک بڑا اور کاسمو پولیٹن مرکز۔ لیکن ہمیں اس کا اندازہ فقط اپنے والدین کی زبانی ہوتا تھا۔ زیادہ تر لوگ اس بارے میں بات بھی نہیں کرتے تھے۔

گورنمنٹ کالج لاہور کے ادبیات کے ایک پروفیسر کی کہانی بھی بڑی دردناک ہے جو اپنے اہل خانہ کو لے کر گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے ہمالیہ کے دامن میں واقع شملہ گیا ہوا تھا کہ تقسیم ہو گئی۔ وہ واپس ہی نہ آ سکا۔ لوگوں نے کہا، ''مارے جاؤ گے، واپس نہ جاؤ۔'' بہت سال کے بعد اس کی بیٹی لاہور بھیجی جاتی ہے۔ اس کا باپ قریب المرگ ہے۔ وہ صرف اپنی کتابیں واپس چاہتا ہے اور سوچتا ہے کہ اس کی لائبریری پر کیا بیتی ہو گی۔ وہ میرے باپ کے پاس آئی جو پروفیسر کو جانتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ آؤ چلتے ہیں۔ دونوں اس خاندان کے مکان پر پہنچے جو لڑکی کو یاد تھا اور اس پر دائیں بازو کے ایک وکیل کا قبضہ ہو چکا تھا۔ اس کا نام اعجاز بٹالوی تھا۔ وہ ان وکیلوں میں سے تھا جنہوں نے ضیا عہد میں بھٹو پر مقدمہ چلایا اور ان جعلی شواہد کی حوصلہ افزائی کی جنہیں بنیاد بنا کر بھٹو کو پھانسی دی گئی۔ گورنمنٹ کالج کے اس بوڑھے پروفیسر کا ماڈل ٹاؤن میں واقع گھر اس وکیل کے قبضے میں تھا۔

وہ گھر کے اندر چلی گئی۔ بٹالوی اسے روک تو نہ سکا۔ کہنے لگا کہ اس کے باپ کی کتابیں ابھی تک الماریوں میں رکھی ہیں۔ اس نے کتابیں نکالیں جہاں اس کے باپ کا نام لکھا تھا وہ جگہ کاٹ کر نکال دی گئی تھی۔ لڑکی نے بٹالوی کو بتایا کہ میرا باپ صرف یہ کتابیں واپس چاہتا ہے۔ میں ان میں سے کچھ لے سکتی ہوں؟ بٹالوی نے جواب دیا، ''نہیں۔'' میرے والد لڑکی کو ایک طرف لے گئے اور کہنے لگے، ''آؤ چلتے ہیں بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔'' ایسے بھی لوگ ہیں جنہوں نے چھوڑی ہوئی جائداد لوٹی، چرائی اور نیا تشخص اختیار کرنے میں کامیاب

MashalBooks.com

ہوئے۔

ہمیں ایک دوسرے سے کاٹ دیا گیا تھا۔ آپ پاکستان سے ہندوستان نہیں جا سکتے۔ واقعی ایک المیہ رونما ہوا تھا۔ سرحدیں ہمیشہ بند رہتی تھیں۔ جب میں اوکسفرڈ میں تھا تو میں نے ہندوستانی دوست بنائے۔ تب پہلی بار میری ہندوؤں اور سکھوں سے ملاقات ہوئی۔ جب ستر اور اسی کے عشرے کے اوائل میں پہلی بار ہندوستان گیا تو مجھے کئی سکھ خاندانوں نے کھانے پر بلایا۔ بچے مجھ سے کہتے، ''ہمارے والدین آپ سے ملنا چاہتے ہیں کیونکہ وہ آپ کے والدین کو جانتے ہیں۔'' بھرپور کھانے کے بعد وہ میرے ساتھ بیٹھتے، میرے ہاتھ میں گلاس ہوتا۔ وہ مجھے کہتے، ''آؤ! بس لاہور کی باتیں کریں۔'' یہ سب نہایت متاثر کن تھا۔

آپ نے ذوالفقار علی بھٹو کا ذکر کیا۔ ستر کے عشرے کے اس وزیراعظم کا تختہ فوجی انقلاب کے ذریعے جنرل ضیا الحق نے الٹایا۔ اس نے پاکستان کی ترقی پر برے اثرات مرتب کیے۔ عظیم پاکستانی سکالر اقبال احمد اکثر ضیاالحق اور اس کی ظالمانہ حکومت کا ذکر کرتے تھے۔

ضیا نے پاکستانی کلچر تباہ کر دیا۔ اس کے عہد حکومت میں افغان جنگ چھیڑی گئی۔ امریکہ نے اسلام کی ترویج کے لیے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ اس کے عہد حکومت میں پاکستان میں وہ کچھ ہوا جو پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ حزب اختلاف کی جماعتوں کے کارکنوں کو سرعام کوڑے مارے گئے، سرعام پھانسیاں لگیں۔ کیا آپ تصور کر سکتے ہیں کہ یہ سب ستر کے عشرے کے اواخر میں ہوا۔ اس نے یہ سب سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کیا تاکہ ملکی کلچر میں تشدد کو فروغ ملے اور حزب اختلاف کو دبایا جا سکے۔ دو سال کے بعد اس نے قتل کے ایک جعلی الزام میں بھٹو کو پھانسی دے دی۔ بھٹو میں بہت سی کمزوریاں تھیں لیکن وہ ملک کا پہلا منتخب وزیراعظم تھا۔ اسے پھانسی دی گئی کیونکہ اسے خوف تھا کہ اگر اسے چھوڑ دیا گیا تو پھر اسے کچلا نہیں جا سکے گا، وہ دوبارہ اقتدار میں آئے گا اور اپنا بدلہ لے گا۔ جب ضیا اقتدار میں آیا تو اس نے بھٹو کے خلاف جھوٹے الزامات جمع کیے اور انہیں اس کے خلاف برتا۔ لوگ کہتے تھے کہ اس عمل کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔ آپ پوچھیں گے ''کیوں؟'' تابوت ایک اور آدمی دو۔ ان میں سے ایک کو جانا پڑے گا۔ بھٹو کے خلاف جھوٹی گواہی مہیا کرنے والا شخص اس کا انٹیلی جنس سربراہ مسعود محمود پکا بدمعاش تھا جس پر بھٹو کو بھروسہ کرنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ اس نے گواہی دی کہ بھٹو

نے قتل کا حکم دیا تھا۔

بھٹو کو پھانسی ہوئی لیکن مسعود محمود پاکستان میں رہنے سے بہت خوف زَدہ تھا۔ اس کے سی آئی اے کے دوستوں نے اسے کیلیفورنیا میں پناہ دلوائی۔ کوئی چند ہفتے پہلے جب میں لاس اینجلس میں تھا تو اچانک میرے پاس ایک جوڑا آیا اور کہنے لگا، ''آپ اس شخص کو جانتے ہیں؟'' میں نے کہا، ''میں اسے نہیں جانتا اور میں اسے جاننا نہیں چاہتا۔'' اور پھر میں نے انہیں اس کی کہانی سنائی۔ انہوں نے کہا، ''کیسی عجیب بات ہے۔ وہ ہمارے پاس آتا تھا اور ہمارے بچوں کو کہانیاں سناتا تھا۔'' میں نے کہا، ''کیا اس نے کبھی تمہیں یہ کہانی بھی سنائی کہ اس نے پاکستان میں کیا کیا اور اسے یہاں کیوں آنا پڑا؟''

جنرل ضیا کے عہد حکومت میں اقتدار پر قبضہ، دار و گیر، بھٹو کا عدالتی قتل ہوا اور اس کے ساتھ ساتھ ملک کے کلچر میں تشدد کو فروغ ملا۔ اس نے اسلامی تنظیمیں بنوائیں جو اس کے دورِ حکومت میں ملک پر غالب آ گئیں۔ افغانستان جنگ کے نتیجے میں ملک میں ہتھیاروں کی بڑی تعداد آئی۔ چونکہ امریکہ سوویت یونین کو شکست دینے پر تلا ہوا تھا۔ چنانچہ رقم کوئی مسئلہ نہ تھا۔ یہ ہتھیار پاکستان سے پوری دنیا میں پہنچے اور ہر کہیں فروخت ہوئے۔ جب امریکی محکمہ دفاع نے بالآخر صورتحال کا جائزہ لینے کے لیے اپنے آڈیٹر بھیجے تو پاکستانی فوج نے اسلام آباد کے قریب واقع اوجڑی میں اسلحے کے ایک بڑے ڈپو کو اڑا دیا۔ بعد میں لوگوں نے مجھے بتایا، ''ہمیں لگا کہ ہندوستان نے جنگ چھیڑ دی ہے۔ فضا میں ہر طرف راکٹ اڑتے نظر آئے۔'' فوج کا دعویٰ تھا کہ یہ اتفاقیہ لگنے والی آگ کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ جب امریکی آڈیٹر پہنچے تو تحقیق کے لیے کچھ نہیں بچا تھا۔ پاکستانیوں نے انہیں بتایا کہ ابھی آپ کے پہنچنے سے چند دن پہلے خوف ناک آگ لگی اور سب کچھ جل گیا ہے۔

> بھٹو کی بیٹی بے نظیر بعد ازاں پاکستان کی وزیراعظم بنی۔ اس پر بھاری بدعنوانی کے الزامات لگے اور عہدہ چھوڑنے پر مجبور کیا گیا۔ غیر حاضری میں اس پر مقدمہ بھی چلا۔ اب وہ یورپ میں مقیم ہے۔ پھر نوے کے عشرے میں نواز شریف کی سربراہی میں سیاسی حکومت بنی۔ حتیٰ کہ 1999، میں پرویز مشرف نے اس کا تختہ الٹ دیا۔ یہ سب کیا تھا؟

بے نظیر اور پھر نواز شریف کی حکومت پاکستان پر اس وقت آئی جب ایک نیا جہان بن

چکا تھا جسے نولبرل دنیا کہا جاتا ہے۔ یہ جہان ہے جہاں صرف دولت اہم ہے۔ اس جہان میں پوری دنیا میں سیاست دانوں کو بدعنوان اور کارپوریشنوں کے ساتھ وابستہ سمجھا جاتا ہے۔ پاکستان میں معاشرہ پہلے ہی بدعنوان تھا۔ وہاں کے سیاست دانوں نے اسے گرین سگنل سمجھ لیا۔ لوگ بے نظیر سے کہتے تھے کہ لوگ آپ اور آپ کے خاوند پر بدعنوانی کا الزام لگاتے ہیں تو بے نظیر کہتی تھی، ''اچھا تو پھر؟ پوری دنیا میں سیاست دان بدعنوان ہیں تو پھر ہم کیوں نہ تھوڑی بہت رقم کما لیں۔'' وہ بھی جلسوں میں بدعنوانی سے مکر جاتی لیکن اندر خانے اس نے ملک کو خوب لوٹا۔ ملک سے اربوں روپیہ باہر لے گئے جو تعلیم اور صحت پر خرچ ہو سکتا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ بہت سے لوگ ان سے نفرت کرتے ہیں۔ کیونکہ انہیں پتہ ہے کہ دراصل کیا ہوا۔ پیپلز پارٹی غریبوں کے نام پر اقتدار میں آئی تھی۔ اسے غریبوں نے ووٹ دیئے تھے۔ جو انتخاب بے نظیر نے ہارا اس میں اسے اپنے ووٹ بنک کا 25 فیصد ملا۔ اب لوگ اسے ووٹ دینے کو تیار نہیں تھے۔ لوگوں نے اس کے مخالفین کو بھی ووٹ نہیں دیا۔ لیکن بے نظیر کو بھی نہ دیا۔ اس الیکشن میں صرف 25 فیصد ووٹ پڑے۔ لوگوں نے عہد کر لیا کہ وہ ان سیاست دانوں کو ووٹ نہیں دیں گے۔ اس کا حریف نواز شریف بھی اتنا ہی بدعنوان تھا۔ اسے مشرف نے اتار پھینکا لیکن نا معقول وجوہات کا بہانہ بنا کر۔ اس کی وجہ نواز شریف کی بدعنوانی نہیں تھی بلکہ اس کا یہ اچھا فیصلہ تھا کہ بطور کاروباری اس نے ہندوستان کے ساتھ تجارتی تعلقات بحال کرنے اور تناؤ کم کرنے کی کوششیں شروع کر دی تھیں۔ لیکن اس نے یہ کام فوج کی منظوری کے بغیر کیا۔ چنانچہ انہوں نے اسے حکومت سے اتارا اور مشرف کو بٹھا دیا۔ شروع میں کلنٹن اس کے حق میں نہیں تھا لیکن 11 ستمبر کے بعد جنرل نے ثابت کر دیا کہ دہشت گردوں کے خلاف وہ امریکہ کا اتحادی ہے۔

امریکہ کی اس حمایت پر مشرف اور ملک کو کیا ملا؟

ساری پابندیاں اٹھالی گئیں۔ اسلحہ پھر سے آنے لگا۔ مدد آنے لگی۔ اس حکومت کو پٹڑی پر رکھنے کے لیے بہت سی رقم امریکہ سے یہاں پہنچی۔ مشرف یہ کہنے کے قابل ہو گیا، ''دیکھو میں نے پاکستان کو دوبارہ دنیا میں لے جا کھڑا کیا ہے۔ ہمیں کچھ دیر ایک اچھوت ریاست سمجھا گیا لیکن اب ریاست ہائے متحدہ کی پشت پناہی سے یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔''

MashalBooks.com

پاکستان پر پابندیاں لگانے کا فیصلہ امریکہ نے نیوکلیائی ہتھیار بنانے اور انہیں آزمانے پر کیا۔

پاکستان پر پابندیاں اس لیے لگیں کہ اس نے نیوکلیائی ہتھیار بنائے اور چلائے لیکن یہ سب کچھ فراموش کیا جا چکا ہے۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں امریکہ کا یہ قیمتی اتحادی بڑے پیمانے کی تباہی کے جتنے ہتھیار چاہے بنا سکتا ہے کوئی مسئلہ نہیں۔ اس اثنا میں ملک کے اندر بھی کوئی قابل ذکر وقوعہ نہیں ہو رہا۔ یہ بھی ایک طرح سے نعمت ہے کہ مشرف اسلام پسند نہیں بلکہ سیکولر شخص ہے۔ لیکن جب تک پاکستان کے سیاست دان لوگوں کے حالات سدھارنے کے لیے کچھ نہیں کرتے کسی طرح کی تبدیلی نہیں آئے گی۔ وہی چکر چل رہا ہے۔ لوگ سیاست دان اور فوج دونوں کے خلاف بے حوصلہ اور تلخ ہو رہے ہیں۔

اس کے پاس ریاست ہائے متحدہ کے لیے کچھ مشورے موجود ہیں۔ اگرچہ اس نے کھل کر تبصرہ نہیں کیا لیکن وہ کہتا چلا آیا ہے کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کے متعلق ریاست ہائے متحدہ کو اپنا انداز فکر بدلنا چاہیے۔ اس کا کہنا ہے کہ دہشت گردی اور انتہا پسندی کی بنیادی وجوہات کو دور کرنا چاہیے۔ اس کا کہنا ہے کہ مسلم دنیا کے مسائل کو نظر انداز کیا جا رہا ہے جو خود ریاستی دہشت گردی کا شکار ہے۔

حیرت ہے کہ اس نے یہ طرز فکر کہاں سے لیا؟ میرا ایک آرٹیکل پاکستانی پریس میں چھپا تھا شاید وہاں سے۔ بہرحال مجھے خوشی ہے کہ اس نے یہ کہا۔ لیکن یہ تبصرہ بہت حقیر ہے۔ میرا خیال ہے کہ وقتاً فوقتاً ایسی باتیں کہنا اس کی مجبوری ہے۔ کیونکہ پاکستان میں ایک بڑی اسلامی حزب اختلاف موجود ہے اور دو صوبوں کو کنٹرول کرتی ہے۔ پاکستان میں پہلی بار اسلام پسندوں کو حقیقی انتخابی جواز ملا ہے۔ وہ بھی اس لیے کہ مشرف امریکی دباؤ کی مزاحمت نہیں کر سکا۔ ان صوبوں میں اسلام پسند اقتدار میں ہیں کیونکہ وہ ملک کی واحد سیاسی قوت ہیں جس نے افغانستان پر امریکی تسلط کی مخالفت کی اور لوگوں کو عراق کے خلاف جنگ کے حوالے سے متحرک کیا۔ کسی اور نے یہ کام نہیں کیا۔

اور اب ریاست ہائے متحدہ کی فوجیں اور اڈے ملک کے اندر موجود ہیں۔

امریکی فوجی اڈے سارے پاکستان میں موجود ہیں اور ہر کوئی جانتا ہے۔ یہی وجہ ہے

کہ جب پاکستان اور ہندوستان کے درمیان جنگ کا خطرہ پیدا ہوا تو میں نے کہا تھا، ''یہ نہیں ہوگی۔ کیونکہ ہندوستان جانتا تھا کہ پاکستان میں موجود امریکی فوجیوں اور اڈوں کی موجودگی میں پاکستان پر حملہ پاگل پن ہوگا۔ ہندوستانی فقط امریکہ پر دباؤ ڈالتے ہیں اور کہتے ہیں، ''ہم بھی یہاں موجود ہیں۔ ہمیں مت بھولو۔'' لیکن پاکستان میں امریکہ کی عسکری موجودگی نے وہاں بڑے غم و غصہ کو جنم دیا۔ اگر افغانستان میں قابض لوگ طالبان کے کسی دھڑے کے ساتھ سودا بازی کرتے ہوئے شمالی اتحاد کو ایک طرف کرتے ہیں تو خدا جانے وہاں کیا نتائج نکلیں۔ ہاں البتہ منشیات سے وابستہ دھڑوں کے درمیان مسلح تصادم فوراً شروع ہو جائے گا۔

1947ء میں دو ریاستوں میں تقسیم کے بعد سے لے کر برصغیر میں ایک مسئلہ نے دونوں ملکوں کو الجھا رکھا ہے۔ کشمیر کا دو تہائی حصہ ہندوستان اور ایک تہائی پاکستان کے پاس ہے۔ اس پر دو جنگیں ہو چکی ہیں۔ 1989ء میں کشمیر میں بغاوت پھیلی اور اس وقت تک دسیوں ہزار لوگ مارے جا چکے ہیں۔ وہاں ہندوستانی فوج لاکھوں کی تعداد میں تعینات ہے۔ کشمیر مدت سے اس حالت میں ہے کہ بڑے پیمانے کی جنگ کا سبب بن سکتا ہے۔ آپ اس مسئلے اور اس کے حل کو مختصراً بیان کر سکتے ہیں۔

کشمیر مسلم اکثریت کی ریاست ہے۔ اس کے ہندوستان یا پاکستان کے ساتھ شامل ہونے کا فیصلہ نہیں کیا گیا۔ ہندوستان نے اس پر فوجی قوت سے قبضہ کیا۔ جواہر لعل نہرو نے کشمیری رہنما شیخ عبداللہ سے وعدہ کیا کہ کشمیریوں کو قومی خود اختیاری کا حق دیا جائے گا۔ اقوامِ متحدہ نے بھی رائے شماری کی قرارداد منظور کی لیکن ہندوستان نے یہ کام نہ ہونے دیا۔ نہرو یہ کام کروانے ہی والا تھا کہ فوت ہو گیا۔ اور اس کے جانشینوں نے اس پر کبھی سوچا بھی نہیں۔ چنانچہ کشمیری بجا طور پر خود کو زیر استبداد سمجھتے ہیں۔ 1989ء کے بعد سے ستر ہزار فوجی مر چکے ہیں۔ اور معاملات خاصے گڑبڑ ہیں۔

جب میری سیکولر کشمیری رہنماؤں سے بات ہوئی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہمیں آزاد فوج اور آزاد خارجہ پالیسی جیسے آزادی کے پھندوں کی ضرورت نہیں۔ وہ تو فقط متحدہ کشمیر میں بیرونی مداخلت کے بغیر آزاد رہنا چاہتے ہیں۔ اس کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ اگر جنوبی ایشیا کی پانچوں بڑی ریاستیں یورپی یونین کی طرز پر ساؤتھ ایشیا یونین بنا لیتے ہیں اور کشمیر اور سری لنکا کے تاملوں کا مسئلہ حل کرنے کے لیے انہیں علاقائی خود مختاری کی ضمانت دیتے ہیں۔

لیکن اس کے لیے آپ کو حقیقی رہنماؤں کی ضرورت ہو گی۔ میرا خیال ہے کہ اس کا امکان موجود نہیں۔

وہ پانچ ریاستیں بنگلہ دیش، سری لنکا، نیپال، ہندوستان اور پاکستان ہوں گی۔

یہی وہ پانچ ریاستیں ہیں جن میں ہندوستان سب سے بڑا ہے۔ یہ ریاستیں ایشیا میں ایک مضبوط اور طاقتور مرکز بنا سکتی ہیں۔ بڑی امپائر کی خواہش ہے کہ یہ ملک منقسم رہیں اور اسے حکومت کرنے میں آسانی رہے۔ ان ملکوں کے لیے یہ فکر بہت اہم ہو گی کہ وہ اپنی قوت کس طرح بڑھا سکتے ہیں۔ مشرق بعید کے خطے کو بھی بالآخر یہی کچھ کرنا پڑے گا۔ اپنے مسائل کو حل کرنے، اپنی آبادی کی مدد کرنے اور امریکی امپائر کے عزائم کی مزاحمت کا یہی ایک طریقہ ہے۔ ہمیں ایشیا کو ایک نئے انداز میں دیکھنا ہو گا۔

لگتا ہے کہ پاکستان اندرونی نفرتوں کے سبب نازک حالت کو پہنچ چکا ہے۔ آپ نے شیعہ سنی فسادات، اسلامی بنیاد پرستی، اسلحہ اور منشیات کی بات کی ہے جو افغان مجاہدین کی دین ہے۔ بیس سال پہلے آپ نے پاکستان کے مستقبل کے حوالے سے ایک کتاب لکھی تھی۔ آپ آج کیا سمجھتے ہیں؟

میری کتاب کا نام تھا ''Can Pakistan Survive?'' لیکن یہ وہ زمانہ تھا جب ہمیں خبر تھی کہ ایران اور افغانستان میں کیا ہونے والا ہے اور ہندوستان میں کیا، جہاں ہندو بنیاد پرسی اقتدار میں آ چکی ہے۔ اسرائیل کی طرح پاکستان بھی ایک نیوکلیائی قوت بن چکا ہے اور اس لیے ان دونوں ریاستوں کو کچھ نہیں ہو گا۔ یہ قائم رہیں گی۔ چنانچہ ہمیں ایسے ذرائع تلاش کرنا ہوں گے کہ فوجی قوت کو معتدل رکھتے ہوئے اس کے ساتھ بقائے باہمی ممکن ہو سکے۔ اسرائیل کی صورت میں ایک آزاد اور خود مختار فلسطین قائم کرنا ہو گا اور اسرائیل کو 1967ء کی سرحدوں پر واپس جانا ہو گا اور پاکستان کے معاملے میں ہمیں ہندوستان کے ساتھ مل کر جنوبی ایشیائی یونین بنانا ہو گی تا کہ فوجی بجٹ کم ہو سکے اور یہاں کے لوگوں کی مدد کی جا سکے۔

6

سامراج کے علمی ستون

ہم ہارورڈ یونیورسٹی میں بیٹھے ہیں جو ممتاز امریکی علمی گہواروں میں سے ایک ہے۔ اس کے مالی وسائل غالباً دنیا میں کئی ممالک کے بجٹ سے بھی زیادہ ہیں۔ بعض اوقات لوگ فوجی صنعتی کمپلیکس کا ذکر کرتے ہیں، جو آئزن ہاور کی مشہور اصطلاح ہے۔ مگر لوگ اکیڈمی یا علمی اداروں کا تذکرہ نہیں کرتے۔ یہ بتایئے کہ ان کا سامراج میں کیا کردار ہے؟

یہ ادارے بے حد اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ تاریخی اعتبار سے یہ سامراج کے مضبوط ستونوں میں سے ایک ہیں۔ یہ تنقیدی ادارے بھی ہوتے ہیں۔ لیکن مجموعی طور پر یہ ادارے سامراج کی نام نہاد خوبیوں کو ہی منعکس اور پیش کرتے ہیں۔ ہاروڈ کا معاملہ خاص طور پر دلچسپ ہے۔ یہ یونیورسٹی اس جگہ بنائی گئی جو کبھی امریکہ کے مقامی باشندوں کی ملکیت تھی۔ جبکہ اس کے بانی کہا کرتے تھے، ''ہم خالی پڑی زمین پر آئے تھے۔'' اس سے ہمیں صیہونی تصور یاد آتا ہے جب پناہ گیر ایک ویران اور غیر آباد زمین کی طرف لوٹ رہے تھے۔ اور اسے زبردستی قبضے میں لے رہے تھے اور کوشش کر رہے تھے کہ اس خوف کو نظر انداز کر دیں اور بھول جائیں جو انہوں نے امریکہ کے مقامی باشندوں پر مسلط کیا تھا۔ ہارورڈ سرد جنگ کے دوران میں ایک طویل عرصے تک حکومتی اسٹیبلشمنٹ کا حصہ رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ وہاں تنقیدی آوازیں بھی بلند ہوتی رہی ہیں۔ اس نے زیادہ تر وہی لوگ پیدا کیے جو بے حد لچکدار تھے۔ لیکن اس ادارے نے زیادہ تر حکومت کا ساتھ اور ان کی ضرورت کے مطابق ڈھلتا رہا۔ میں سیموئل ہننگٹن، فوکویاما اور برنارڈ لیوس کو دیکھتا رہا ہوں۔ لیوس بتاتا ہے کہ امریکہ مسلم دُنیا میں

MashalBooks.com

جمہوریت کے لیے کوشاں ہے۔ یہ وہ شخصیت ہے جو 1950 کے عشرے میں سرد جنگ کے دوران اپنی گفتگو اور تقریروں میں اصرار کرتا رہا ہے کہ اسلام اور کمیونزم جڑواں ہیں۔ اس وقت امریکی سامراج کمیونزم کو شکست دینے کے لیے اسلام کو استعمال کر رہا تھا۔ لیوس اسلام کا اس قدر دشمن تھا کہ اس نے پہلی اور آخری بار انتظامیہ کے عمومی رجحان کے خلاف جانے کی بھی کوشش کر ڈالی۔ وہ انتظامیہ کے اسلام کے ساتھ قریبی تعلقات پر پریشان تھا۔ اس نے کہا کہ اسلام اور کمیونزم جڑواں ہیں۔ ان کی اجتماعی ہیئت کی سوچ یکساں ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جو بنیادی طور پر ان اداروں پر اس قدر غلبہ رکھتے تھے معروضی سوچ کے حامل دانشوروں کے لیے یونیورسٹی کے عمومی رجحان کو تبدیل کرنا مشکل تھا۔ کمیونسٹ دنیا کے زوال کے بعد مابعد جدیدیت اور ثقافتی علوم، جنھوں نے تاریخ کے مطالعے اور اس کے حصول کی کوشش کو رسوا کیا، کی مقبولیت کے بعد یہ ادارے ترقی سے آگے کی بات کرتے ہیں۔ امریکی سامراج کی نئی سرگرمی اور بش اور روس کے ساتھیوں (neocons) جو اپنی طاقت کے بے تحاشہ استعمال سے گریز نہیں کرتے اور جو کہتے ہیں کہ ''ہم ایسا کرتے ہیں، اس لیے کہ ہم ایسا کر سکتے ہیں اور اس لیے کہ یہی ہمارے مفاد میں ہے اور صرف مفادات ہی ہمیں عزیز ہیں'' کی دھونس کے بعد، ان اداروں کے اس حصے یا ونگ کے لیے مسئلہ پیدا ہو گیا ہے، جو یہ سمجھتے تھے کہ وہ اپنی دنیا میں مگن رہ سکتے ہیں۔ ان اداروں کی خواہش تھی کہ ان کا طریق تنقیدی ہو۔ مگر اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ وہ بری بحثوں، جیسے سیاست اور تاریخ وغیرہ کی مباحث، میں نہ الجھیں کیونکہ یہ پرانی چیزیں ہیں۔ انہیں نئی چیزوں کا چسکا تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے اجزا اور چھوٹی چھوٹی کہانیوں پر بحث کرتے، وہ صنف اور تشخص کے بارے میں گفتگو کرتے، جو قطعی غیر اہم ہیں، تاریخ بتاتی ہے کہ اب یہ صورت نہیں رہی۔ ان اداروں کو اگر آگے بڑھانا ہے تو اسے زیادہ تنقیدی طرزِ عمل اختیار کرنا ہوگا۔

ایک اور چیز کا ذکر کروں گا، جس کی سامراج کو ضرورت ہے اور یہ ادارہ اس کی نشوونما کرتے ہیں۔ مشرقی عرب کے بحران کے دوران ایک نئی نوع نے جنم لیا ہے۔ یعنی فواد عجمی اور کنعان مکیہ جیسے لوگ جو سامراج کو خوش کرنا اور ان کی ضروریات کو پورا کرنا چاہتے ہیں۔ جہاں تک عجمی کا تعلق ہے وہ جس طرح سامراج کے آگے ذلت کی حد تک جھکے جاتا ہے، اس پر اسے ذرا شرم نہیں آتی۔ یہ لوگ وہ باتیں کرتے ہیں جو امریکی محض سوچتے ہیں۔ مگر وہ یہ باتیں سرعام کرنے کی جرأت نہیں کرتے۔ یہ ہے ان کی قدر و قیمت کہ وہ ان جذبات کو الفاظ

کا روپ دینے کے خواہش مند نہیں۔ برسراقتدار پارٹی اور امریکی انتظامیہ بیان دینے سے گریز کرتی ہے۔ اگرچہ وہ نجی طور پر اس سے اتفاق ہی کیوں نہ کرتے ہوں۔ یہ لوگ ہمارے بگڑے ہوئے میڈیا میں کوئی گوشہ ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ جہاں ایسے لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ دکھا سکیں کہ دیکھو یہ عرب ہیں اور ہماری طرف ہیں۔ دیکھو وہ کتنے ذہین ہیں۔ یہ واقعی ''ذہین'' ہیں کیونکہ یہ ایسی باتیں کرتے ہیں جو لوگ سننا چاہتے ہیں۔ ان کی ذہانت مکمل طور پر ان کے وسائل پر انحصار کرتی ہے۔ وہ مفید ہوتے ہیں اسی لیے ان کو استعمال کیا جاتا ہے۔

بہت سے لوگ اس جال میں پھنس جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان میں اچھے لوگ بھی شامل ہوتے ہیں۔ میرا ایک پاکستانی دوست احمد رشید بھی افغانستان پر قبضے کے بعد اس جال میں پھنس گیا تھا، کیونکہ طالبان کے بارے میں اس کی کتاب کو شان دار پذیرائی مل گئی تھی اور اس کی ضرورت تھی۔ امریکیوں کو طالبان کے بارے میں مطالعے کے لیے کسی کتاب کی ضرورت تھی۔ اور احمد رشید کی کتاب اس ضرورت کو پورا کرتی تھی۔ میں احمد کو بہت چاہتا ہوں اور وہ خود عجمی یا کنعان مکیہ جیسا نہیں ہے، لیکن اس جیسے لوگ بھی سامراجی ترغیبات میں الجھ جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ عام لوگ امریکی مداخلت کے بغیر اپنے آپ کو بندشوں سے آزاد نہیں رکھ سکتے۔ میں نے ایک عرصہ سے احمد رشید سے بات نہیں کی اور مجھے امید ہے کہ وہ باز آ گیا ہوگا۔ پالتو عرب دانشور سامراج کے گماشتے ہیں۔ انہیں اپنا مستقبل اسی میں نظر آتا ہے اور وہ شاید اس طرح آگے بڑھنے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ وہ بہت خوش لوگ ہیں اور انہیں کوئی مسئلہ درپیش نہیں۔

> عجمی کا وطن مالوف لبنان ہے۔ وہ جان ہاپکنز یونیورسٹی میں پروفیسر ہے۔ اور کبھی کبھی نیٹ ورک کے ٹاک شو میں مہمان کے طور پر شامل ہوتا ہے۔ وہ CBS نیوز میں مبصر ہے اور ڈلن راتھر، کو عربوں اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں موجود پیچیدگیوں کے سلسلے میں مشورے دیتا ہے۔ آپ نے House Arabs کی اصطلاح استعمال کی ہے تو مجھے اس میں دلچسپی پیدا ہوئی ہے۔ کیونکہ اس سے میلکم ایکس کی یاد تازہ ہو گئی ہے۔ جس نے جنگلی نیگرو اور گھریلو نیگرو میں امتیاز کیا تھا۔ جنگلی نیگرو باغی اور ہنگامہ پرور تھے اور جاگیرداروں کی حویلیوں کو جلاتے تھے۔ جبکہ پالتو نیگرو وفادار نوکر تھے اور اگر حویلیوں کو آگ لگا دی جاتی تو وہ اسے بجھانے کی جدوجہد کرتے۔

MashalBooks.com

House Arabs کی اصطلاح میلکم کے سامراج کا ساتھ دینے والوں کے لیے برتی تھی۔ میرے خیال میں House Arabs میلکم کے گھریلو نیگروز سے بھی زیادہ برے ہیں کیونکہ وہ بہرحال غلام تھے۔ وہ ایسے غلام تھے جن کا Gone With the Wind اور دوسری کتابوں میں ذکر آیا ہے۔ وہ مکمل وفادار ہوا کرتے تھے۔ لیکن یہ یاد رکھنا ہوگا کہ وہ غلام تھے۔ جبکہ House Arabs آزاد ہیں۔ ان کے اعمال سراسر رضاکارانہ ہیں اور اسی لیے وہ زیادہ برے ہیں۔ ان کے ہاں معروضیت نہیں ہے۔ میں ان سے یہ توقع نہیں کرتا کہ وہ عراقی مزاحمت کی حمایت کریں۔ لیکن خدا کے لیے انہیں اتنا تو غور کرنا چاہیے کہ وہ کیا ہو رہا ہے۔ دیکھیں کہ مشرق وسطیٰ میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ مکمل تباہی ہے لیکن یہ لوگ ایسا نہیں کرتے۔ وہ تو سامراج کے مشیر بننا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ''آپ کی کارکردگی مناسب نہیں۔ یہی کام یوں بہتر ہو سکتا ہے۔ اس طرح لوگ مارے جائیں گے۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔'' یہ ہے وہ کردار جو بعض لوگ ادا کر رہے ہیں۔

ایک اور نوع ہے لوگوں کی، جو یہ سمجھتے ہیں کہ شمالی امریکہ کی سوسائٹی میں ضم ہونے کا یہ واحد راستہ ہے یعنی یا تو یونیورسٹیوں کے ذریعے یا پھر ایسی کتابیں لکھ کر جو میڈیا پر مقبول ہوں۔ کینیڈا کی ایک مسلمان ارشاد مانجی (Manji) نے ایک کتاب "The Trouble With Islam" لکھی ہے۔ کل اس نے ہارورڈ میں خطاب کیا۔ وہاں میرا بھی ایک لیکچر تھا۔ اس نے جو کچھ کہا وہ صیہونیت سے بھرا پڑا تھا۔ اس نے ساری شام فلسطینیوں کی دہشت گردی کی مذمت میں صرف کر دی۔ تو ان لوگوں کو یوں برتا جاتا ہے۔ میں تمام مذاہب، حتیٰ کہ اسلام کے بارے میں بھی تنقیدی نقطۂ نظر رکھتا ہوں۔ لیکن خود کو یوں ''برائے استعمال'' بنا لینا مکروہ عمل ہے۔

> تاریخی اعتبار سے دیکھیں تو سامراج کو ہمیشہ ایسے مخبروں کی ضرورت رہی ہے جو اسے اطلاعات فراہم کرتے رہیں۔

یہ ایک طرح سے تاریخی سچائی ہے۔ جو ہر سامراج پر منطبق ہوتی ہے۔ غیر ملکی طاقتیں جو کسی ملک پر قبضہ کرنا چاہتی ہوں از خود ایسا نہیں کر سکتیں۔ حتیٰ کہ رومنوں کو بھی مقامی امداد درکار ہوتی تھی۔ اور وہ اسے حاصل کرتے تھے۔ اس کے بدلے میں وہ لوگوں کو بلا امتیاز رنگ و نسل روم کی شہریت دیتے تھے۔ اگر آپ Nubian ہیں مگر آپ نے رومنوں کے لیے کام کیا

ہے تو آپ کو شہریت دی جائے گی۔

آپ میکسیکو پر سپین کی فتح کو دیکھیں۔ کورٹے کی معشوق بن جانے والی Malinche نے اسے اپنے علاقے کے راز دے دیئے جو کہ ایزٹیک کا صدر مقام تھا۔ اگر آپ ڈائگو ریورا کی دیواری تصاویر دیکھیں، اسے بنیادی طور پر ایک فاحشہ کی دکھایا گیا ہے جو وہاں قدرے ننگی کھڑی ہے۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، برطانوی سامراج یعنی گزشتہ حقیقی سامراج... نے بھی ہندوستان میں اپنے چھتیس ہزار سے زیادہ سپاہی نہیں رکھے۔ اگر انہیں مقامی حمایت حاصل نہ ہوتی تو وہ لاکھوں کروڑوں ہندوستانیوں پر حکومت نہیں کر سکتے تھے۔ برطانوی بڑے چالاک تھے۔ وہ ملک کا سماجی ڈھانچہ تبدیل کر کے اور سلسلہ وار عمل کے بعد جاگیرداروں کا ایک طبقہ پیدا کر کے اپنے لیے ضروری معاونت حاصل کرتے تھے۔

مغلوں کے دور میں دیہاتیوں کا ایک گروہ تھا جو ٹیکس اور ریونیو جمع کرتا تھا۔ ہم انہیں ٹیکس وصول کرنے والے کہہ سکتے ہیں۔ ان کا اثر و رسوخ کو دیکھ کر انگریزوں نے انہیں ایک خاص علاقے کے مالکانہ حقوق دے دیئے جہاں سے وہ ٹیکس اکٹھا کرتے تھے۔ اس طرح، خاص طور پر بنگال، پنجاب، اتر پردیش اور کشمیر میں جاگیرداروں کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا۔ یہ لوگ ایک مضبوط ستون کی حیثیت رکھتے تھے۔ جن پر برطانوی سامراج اعتماد کر سکتا تھا۔ جب اس اتحاد میں دراڑیں پڑیں تو برطانوی سامراج بھی دھڑام سے گر گیا، سو مقامی اتحادیوں کے بغیر سامراج کبھی قائم نہیں رہ سکتا۔

اگر عراق کے کردوں اور شیعہ حضرات کا ایک معتد بہ حصہ سامراج کے خلاف مزاحمت پر نکل آتا تو سامراج کا قبضہ سالوں میں نہیں، چند مہینوں میں ختم ہو جاتا۔ اب کام شروع ہو چکا ہے۔ اتحادی سامراج کے لیے انتہائی اہم ہیں ان کے بغیر سامراج قائم نہیں رہ سکتا۔ یہی اس کی حقیقت ہے۔ اب آتے ہیں میلکم کے نقطۂ نظر کی طرف۔ اگر غلاموں کی طرف سے مسلسل بغاوت جاری رہتی اور پالتو نیگرو نہ ہوتے، جنوب میں مسلسل بغاوت جاری رہتی تو سارا نظام سول وار سے پہلے ہی تہ و بالا ہو جاتا۔

> گارڈن کے مطابق کنعان مکیہ ''عراق کا سب سے نمایاں منحرف مفکر'' ہے۔ اس نے کمانڈر انچیف جارج بش سے ایک ملاقات کی اور اسے بتایا کہ امریکی فوج عراق میں داخل ہوئی تو اس کا پھولوں اور مٹھائیوں سے استقبال ہوگا۔

MashalBooks.com

گارڈن کے اس خاکے کے پس منظر میں ایک کہانی ہے۔ اس صحافی کو ہدایت کی گئی تھی کہ دفتر خارجہ کی منہ بھرائی، کے طور پر مکیہ کا انٹرویو کرے۔ بظاہر یہ بڑا بھونڈا سا کام تھا۔ اس نے کہا کہ کوئی کاغذ پر اس کی بڑی تابعدار اور خواہش مندانہ قسم کی تصویر چاہتا تھا۔ لیکن اس نے اسے مدھم کر دیا تھا، اس کی وجہ بہت سادہ سی ہے۔ جب ریاستیں جنگ پر کمربستہ ہوں تو وہ ان لوگوں کو بڑھاوا دیتی ہیں جو ان کی ضروریات کو پورا کر سکتے ہیں۔ مکیہ نے بہروپ بھرا گویا وہ ایک پر اذیت اور دکھی روح ہے۔ جسے عراقی مفادات کے سوا کسی شے سے لگاؤ نہیں۔ میں اسے جانتا ہوں، 1970 کے عشرے میں ہم ایک ہی سیاسی تنظیم سے وابستہ تھے۔ مجھے یہ کہنا ہے کہ وہ ہمیشہ سے کسی حد تک خود مرکزیت کا شکار تھا۔ اب بھی ویسا ہی ہے۔ یہ جو وہ دوسروں کے بارے میں کہتا ہے کہ وہ مسیحا کی آمد کا عقیدہ رکھتے ہیں، وہ خود غالب حد تک اس عقیدے پر یقین رکھتا ہے۔ اس کی کتاب "The Republic of Fear" پہلی خلیجی جنگ میں کلیدی حیثیت اختیار کر گئی۔ مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی محسوس ہوتی ہے کہ ہم نے اسے اپنے ادارے Verso کی طرف سے چھاپنے سے انکار کر دیا۔ ہم تو اس وقت بھی پیش بینی کر سکتے تھے۔ مکیہ نے پہلے اسے Verso میں پیش کیا، مگر ہم نے اسے ایک غیر متوازن کتاب قرار دیا۔ ایڈیٹروں میں ایک روبن بلیک بدن نے دس صفحات پر مشتمل ایک تبصرہ لکھا۔ مجھے اس سے انکار نہیں کہ کتاب میں کچھ دلچسپ باتیں بھی ہیں۔ وہ ساری کی ساری کوڑا کرکٹ سمجھ کر رد نہیں کی جا سکتی۔ اس کے مرکزی تصورات میں سے ایک یہ ہے کہ عراق برطانوی تسلط کے زمانے میں بہتر حالات میں تھا۔ اس کتاب میں ایسے اوراق بھی ہیں جن میں شاہ فیصل کی تعریف کی گئی ہے کہ وہ ایک روشن خیال حکمران تھا۔ یوں خلیجی جنگ کے دوران مکیہ نے فیصلہ کیا کہ عراق کا بہتر مستقبل سامراجی قبضے ہی سے ممکن ہے، مکیہ کو اس خدمت کا اجر دیا گیا۔ اس بدنظمی میں، جو پیدا کی گئی، ہمیں عجمی اور دیگر کم معروف پالتو عربوں کی انگلیوں کے نشان نظر آتے ہیں۔ لیکن صرف جزوی طور پر... کیونکہ ہمیں ان لوگوں کے اثر کے بارے میں مبالغے سے کام نہیں لینا چاہیے جنہوں نے حملہ کی ترغیب دی اور کہا کہ امریکی فوجیوں کا پرجوش استقبال ہوگا۔ فوج خود سے اس طرح کا فیصلہ نہیں کر سکتی تھی۔ ان کا عراق سے کوئی براہِ راست رابطہ ہی نہیں رہا۔ وہ یہ جاننے میں ناکام رہے کہ جنوبی عراق کے شیعہ تک، جو صدام سے سخت نفرت کرتے تھے، حملہ آوروں کا پھولوں سے استقبال کرنے پر تیار نہیں تھے۔

مکیہ کو بہتر علم ہونا چاہیے۔ اس کی ماں برطانوی ہے اور والد پیدائشی طور پر عراقی اور ایک

ممتاز اور مشہور ماہر تعمیرات۔ جس نے عراق چھوڑنے سے پہلے صدام حسین کے لیے کچھ عمارتیں تعمیر کی تھیں۔ اب اس کا بیٹا اصرار کر رہا ہے کہ امریکہ ان عمارات کو بموں سے اڑا دے جو خود اس کے والد نے تعمیر کی تھیں۔ یہ ایک ایسا منظر نامہ ہے کہ وی آنا کے کسی ڈاکٹر کو اس کا تجزیہ کرتے ہوئے بڑا لطف آئے گا۔

یہ تاثر قطعی احمقانہ ہے کہ سامراجی طاقتیں دنیا کے حالات میں روشن تبدیلیوں کی خواہش اور مقصد کو عملی جامہ پہناتی ہیں۔ یہ وہ بات ہے جسے کنعان مکیہ اور اس جیسے دوسرے پالتو عرب دانشور ہمیشہ نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ساری تاریخ میں یہ ایک بنیادی بات ہے کہ سامراجی طاقتیں ہمیشہ اپنے مفادات کے مطابق کام کرتی ہیں۔ اور یہ صرف مفادات ہیں جن کا وہ خیال کرتے ہیں حتیٰ کہ جب وہ کسی ملک پر قبضہ کرتے ہیں اور اس میں تبدیلیاں لاتے ہیں اسے نئی شکل دیتے ہیں تو صرف اپنے مفادات کے پیش نظر اور ان کے مطابق کرتے ہیں۔ وہ کسی ملک کی بھلائی کے لیے مداخلت نہیں کرتے، بلکہ اس لیے کرتے ہیں کہ اس سے ان کے مفادات وابستہ ہوتے ہیں۔ اور اسی بات کو نظر انداز کرنا ان لوگوں کی سب سے بڑی غلطی اور کمزوری ہے۔ وہ یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ برطانوی سامراج اپنی زندگی کے آخری چالیس یا پچاس سال، قومیت پرستی اور کمیونزم کی ابھرتی ہوئی لہر کے خلاف برسرپیکار رہا اور یہ شعلے روسی انقلاب کے ساتھ ہی بھڑک اٹھے تھے۔ جس طرح اٹھارویں صدی میں انقلاب فرانس کی کامیابی نے، ہیٹی اور جزائر غرب الہند اور وسطی امریکہ کے درمیانی علاقوں میں رہنے والے غلام باشندوں میں جوش و خروش پیدا کر دیا جس کے نتیجے میں تاؤسینٹ دل اوورچر (Tercssaint Ovxerture) نے تمام نوآبادیاتی ممالک میں قوم پرستی کی لہر دوڑا دی۔

> فواد عجمی اور برنارڈ لیوس کی طرح مکیہ بھی اکثر ٹاک شوز میں بطور مہمان شرکت کرتا رہتا ہے اور بوسٹن میں برینڈلیس یونیورسٹی میں پروفیسر ہے۔

امریکی یونیورسٹیوں میں ملازم ہیں اور انہیں ٹیلی ویژن کی سکرین پر غلبہ حاصل ہے کیونکہ سامراج کو ان کی ضرورت ہے۔ یہ ضروری ہے کہ انہیں ٹیلی ویژن پر لایا جائے۔ چنانچہ امریکی کہہ سکتے ہیں۔ ہم تو جنگ نہیں چاہتے... خود عرب ایسا چاہتے ہیں۔'' اور اللہ خوش رکھے انہیں۔ یہ لوگ کام کر رہے ہیں۔ ان کا مقدر اپنے آقاؤں کے ساتھ وابستہ ہے۔ عراقی

تباہی کی وضاحت کس طرح کی جاسکتی ہے؟ مجھے یقین ہے کہ مکیہ جیسے نرگسیت پرست کہیں گے، ''یہ تباہی اس لیے آئی کہ انہوں نے میرے کہے پر عمل نہ کیا۔ اگر وہ میری نصیحت پر عمل کرتے!'' معاف کیجئے انہوں نے تمہاری ہی نصیحت پر عراق پر حملہ کر دیا۔ احمد شلبی نے ہی وعدہ کیا تھا کہ وہ عراق کا کچھ حصہ اسرائیل کو دے دے گا۔ اس نے کہا تھا کہ اگر میں اقتدار میں آ گیا تو چھ ماہ میں اسرائیل کو تسلیم کر لوں گا۔ ہاں تو جوان، اب تمہیں وہاں چھ ماہ سے زیادہ عرصہ گزر گیا ہے اور حکومت بھی کٹھ پتلی ہے۔ تم اس کے تحت اسرائیل کو تسلیم کرنے کے قابل نہیں ہوا اور یہ ہے حقیقت۔

اچھا اب میں ترینی داد کے پیدائشی اور ہندی الاصل وی ایس نائپال کے بارے میں پوچھنا چاہوں، جو 1950 کے اوائل سے برطانیہ میں مقیم ہے۔ اسے بہت سے ناولوں کی بنا پر نوبل پرائز سے نوازا گیا ہے۔ تاہم اس نے کچھ دوسری کتابیں بھی لکھی ہیں۔ جن میں سے ایک اسلام کے بارے میں ہے، جس کا نام ''Among the Believers'' ہے۔'آپ اسے ہمہ دانی کی اس کہکشاں میں کہاں کھڑا کرتے ہیں؟

سر ودیا نائپال ...وہ عجب شخص ہے۔ ان لوگوں سے قطعی مختلف۔ وہ ایک الگ نسل کا نمائندہ ہے۔ وہ 1930 کے عشرے میں پیدا ہوا۔ 1930 اور 1940 کے عشروں میں ترینی داد میں پلا بڑھا۔ 1950 کی دہائی میں برطانیہ چلا آیا اور نوآبادیاتی وضع اختیار کر لی۔

یعنی جنہیں کالا صاحب (Brown Sahib) کہا کرتے تھے۔

ہاں بالکل یہی۔ دراصل وہ انگریزوں سے بڑا انگریز بننے کا متمنی تھا۔ اور یہ بات اس کے حق میں گئی۔ اس سے انکار نہیں کرنا چاہیے۔ میں اور ایڈورڈ سعید اس کے بارے میں بڑی باتیں کیا کرتے تھے کہ وہ واقعی ایک ذہین رائٹر ہے۔ ایڈورڈ کہا کرتا ''وہ 1970 اور 1980 کی دہائی میں ابھرنے والے اکثر ناول نگاروں سے کہیں بہتر لکھاری ہے۔ کہیں بہتر لکھتا ہے'' اس سے اس کا یہ اعزاز کبھی نہیں چھیننا چاہیے۔ ایک لکھاری اور ناول نگار کی حیثیت سے میرے دل میں اس کا بڑا احترام ہے۔ البتہ میں اس کی سیاست سے متفق نہیں ہوں۔ جو یقیناً ردعمل کی پیداوار ہے۔ وہ جنہیں پسند نہیں کرتا، انہیں بہت لتاڑتا اور اشتعال دلاتا ہے۔

MashalBooks.com

اسلامی دنیا کے ساتھ اس کی دشمنی میں قدرے کمی آئی۔ جب پاکستان کے پچھلے سفر کے دوران اسے نادرہ نامی خاتون سے محبت ہو گئی۔ پاکستانی مذاقاً کہتے ہیں کہ وہ مسلمان نہ ہوا ہوتا تو نادرہ اس سے شادی نہ کرتی۔ میں جب بھی لاہور یا کراچی جاتا ہوں تو لوگ اس موضوع پر بات چھیڑتے ہیں۔ میں کہتا ہوں ''مجھے ثبوت دو، کیونکہ یہ بڑی پرلطف بات ہو گی۔ مگر کوئی شہادت نہیں ملتی۔ اگرچہ نادرہ بی بی پکی مسلمان ہے۔ وہ ڈھلمل یقین نہیں ہے۔ وہ پوشیدہ طور پر مسلمان ہو گیا تو ایک دن پتہ چل جائے گا۔

اس کا کردار بہت معمولی ہے۔ وہ بنیادی طور پر بڑا بھاری لکھاری ہے۔ دائیں بازو کی بنیاد پرست جماعت بھارتیہ جنتا پارٹی کی حکمرانی کے ابتدائی دنوں میں اس نے اس کی حمایت میں کچھ بیان دیئے۔ ان میں دعویٰ کیا گیا کہ مسلمان فاتحین کے حملوں نے ہندوؤں کو سخت آزار پہنچایا۔ ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ یہ سب احمقانہ باتیں ہیں۔ ساری تاریخ کھنگالی جا چکی ہے۔ اگر آپ ہندوستان کے سنجیدہ مؤرخوں مثلاً رومیلا تھاپڑ کو پڑھیں تو آپ دیکھیں گے کہ اس دور میں دنیا بھر میں ہجرت اور حملوں کا دور دورہ تھا۔ حملہ آور ... خواہ وہ اوائل کے ہند یورپی تھے یا بعد میں مسلمان ... آئے اور گھل مل گئے۔ اس طرح معاشرے تبدیل ہو گئے۔ یوں کہیے کہ وہ معاشروں کی ترکیب سازی کا دور تھا۔ ہندتوا کے زیر اثر تاریخ کو وقتی ضروریات کے مطابق بدلنے کی پوری کوشش ہوئی۔ اور بعض اوقات نائپال نے اس کی حمایت کی۔ وہ بعد میں نادم بھی ہوا اور اس بات سے انکار کیا کہ اس نے اس حکومت کی حمایت کی ہے۔ اس نے کہا کہ وہ 2002ء میں مسلمانوں کے خلاف وسیع پیمانے پر تشدد اور قتل و غارت سے خوفزدہ ہو گیا تھا۔ وہ بنیادی طور پر ایک سیاسی شخص نہیں ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اصل میں ایک ثقافتی قدامت پسند ہے۔

> ''اگر وہ ہم سے نفرت کرتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ پسماندہ ہیں۔'' یہ ایک کلاسیکل سامراجی نقطہ نظر ہے۔

اصل میں یہ وہ نقطہ نظر ہے جو ہمیشہ سامراجی طاقتوں نے اپنایا۔ اگر ہم تمہیں فتح کر رہے ہیں تو ظاہر ہے کہ ہم تم سے برتر ہیں، اگر ایسا نہ ہوتا تو ہم تمہیں کیسے فتح کرتے۔ مگر تاریخی اعتبار سے ہمیشہ ایسا نہیں رہا۔ چنگیز خان نے دنیا کی سب سے بڑی سلطنت قائم کر لی۔ اس نے دنیا کے بہت بڑے حصے پر قبضہ کر لیا۔ اس کے وارث چین اور ایران پر قابض ہو

گئے۔اور ہندوستان کے بعض حصوں میں گھس گئے۔اس نے روس اور یوکرائن پر بھی قبضہ جما لیا اور یورپ کے دروازے تک جا پہنچا۔ تیرھویں صدی میں اس کے جانشینوں نے بغداد پر بھی قبضہ کر لیا۔ لیکن ان کی زبان تو لکھی بھی نہیں جاتی تھی۔ چنانچہ انہوں نے ملکوں پر قبضہ کیا اور لکھے ہوئے لفظوں کو نیست و نابود کیا، انہوں نے لائبریریوں کو جلا دیا کیونکہ وہ جبلی طور پر جانتے تھے کہ انہوں نے برتر تہذیبوں کو زیر کر لیا ہے۔ چنانچہ وحشی طاقتوں کو ثقافتی یا فکری برتری کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اگر وحشی طاقتوں کے لیے تہذیبی برتری ضروری ہوتی تو ہم کہتے کہ تیسری رائخ اپنے مفتوحین سے برتر تھی۔اور یہ ایک احمقانہ بات ہے۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ سرمایہ داری نے یورپ میں فتح پا کر اور ٹیکنالوجی کے اعتبار سے برتری حاصل کر کے اپنے لوگوں کو تعلیم سے آراستہ کرنا شروع کیا ـــ سلطنت کو چلانے کے لیے اس تعلیم کی ضرورت تھی۔ بلکہ واقعہ یہ ہے جب برطانوی ہندوستان پر قابض ہوئے تو پہلے پہل آنے والے انگریز ہندوستانی شہروں کی امارت دیکھ کر حیران رہ گئے۔ انہیں حیرت تھی کہ یہ شہر کس قدر ترقی یافتہ ہیں۔ وہ اس سرزمین کی زرعی ترقی، اور ڈھاکا اور دہلی کی عمارات دیکھ کر ششدرر رہ گئے کہ یہ سب یورپ سے ارفع تھا۔ چنانچہ اولین ردعمل میں انہوں نے خزانے اور سامان لوٹ لیا اور قوت استعمال کی۔ یہ بات انتہائی مضحک ہے کہ انہوں نے ایک ادنیٰ تہذیب پر فتح پائی تھی۔ اور یہ تاثر بھی ایسا ہی ہے کہ وہ ممالک جنہوں نے شنگھائی کے بعض حصوں پر قبضہ کیا وہ کسی طور پر چین کی تہذیب سے برتر تھے۔ سرمایہ داری نے پہلے یورپ میں ترقی کی اور اس نے ٹیکنالوجی میں خاصی پیش رفت حاصل کر لی۔ فطری بات ہے کہ یہ ٹیکنالوجی اہل یورپ استعمال کرتے تھے تاکہ اپنے مفادات کو بڑھاوا دے سکیں۔ لیکن مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے کہ یورپ کی تہذیبیں کسی بھی طور پر دوسروں سے برتر تھیں۔ وہ ٹیکنالوجی میں اپنی اولیں برتری کو دنیا کے مختلف حصوں کو لوٹنے کے لیے بروئے کار لاتے تھے۔ پہلے وہ اس مقصد کے لیے غلامی سے فائدہ اٹھاتے تھے، پھر سامراجی فتوحات کے ذریعے ایسا کرنے لگے۔ اور اس طرح انہوں نے سامراجی سلطنتیں بنا لیں۔ اور اپنی سوسائٹی کی نام نہاد برتری کا ڈھنڈورا پیٹنے لگے۔

یہ دلچسپ بات ہے کہ لفظ ''لُوٹ'' (Loot) جو انگریزی میں مستعمل ہے، بنیادی طور پر جنوبی ایشیا سے آیا ہے۔

یہ ہندی اور اردو کا لفظ ہے۔لیکن سلطنت کی بدولت اب انگریزی لغت میں شامل ہے۔

آپ 1943ء میں پیدا ہوئے۔ گویا آپ کی پرورش اس دور میں ہوئی جب نام نہاد تیسری دنیا اتھل پتھل کا شکار تھی۔ تب اسے ''تیسری دنیا'' نہیں کہتے تھے۔ بہرحال وہاں نوآبادیاتی نظام دم توڑ رہا تھا۔ اس زمانے میں انڈونیشیا میں وسطی جاوا کے ایک شہر بنڈونگ میں، کانفرنس منعقد ہوئی، جسے بنڈونگ کانفرنس کا نام دیا گیا اور اس میں نہرو، چواین لائی، سوئیکارنو، نکروما، ٹیٹو اور ناصر شامل ہوئے تھے۔ اور اس سے تاثر ملا کہ واقعتہً ایک نئی دنیا نمو پذیر ہو رہی ہے۔ چنانچہ بڑا جوش وخروش پایا جاتا تھا۔ بعد میں بنڈونگ کی اصل روح کو کیا ہوا؟

نوآبادیاتی نظام تازہ تازہ ختم ہو رہا تھا۔ چنانچہ جوش وخروش کا پایا جانا فطری امر تھا۔ ان ممالک کی آبادی عینیت پرست تھی۔ انہوں نے سوچا کہ اس طرح وہ آگے بڑھ سکیں گے۔ جہاں تک بنڈونگ کی اصل روح کا تعلق ہے تو نہرو، ناصر اور ٹیٹو نے تیسری دنیا کے لیے تیسرے راستے کی نمائندگی کی۔ یہ واقعی تیسرا راستہ تھا جو سرمایہ داری سے بھی الگ تھا اور سٹالن کے انداز کے کمیونزم سے بھی مختلف۔ وہ سوویت سیاسی ڈھانچے کی نقالی نہیں چاہتے تھے اور یہ بڑی دانشمندی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جوش وخروش پیدا ہو گیا۔ پھر اس کا باعث یہ بھی تھا کہ اس دور میں امریکہ دنیا کی واحد سپر پاور نہیں تھا۔ سوویت یونین بھی سپر پاور کی حیثیت رکھتا تھا۔ چین کے انقلاب نے بھی اس تحریک کو بے پناہ تقویت بخشی۔ چین، دنیا کا سب سے بڑا ملک بہت بڑے سماجی ابھار کا نمونہ بنا۔ تو بنڈونگ کانفرنس نے اس روح کی نمائندگی کی۔

اس کے ساتھ کیا بیتی؟ ان ممالک میں سے اکثر نے بہتیری کوشش کی کہ وہ سرد جنگ سے الگ رہیں، مگر ایسا نہ ہو سکا، بالآخر وہ الجھ گئے۔ انڈونیشیا جس نے اس کانفرنس کی میزبانی کی تھی، بنڈونگ کانفرنس کے دس سال کی بعد ایک ناگہانی انقلاب کا شکار ہوا۔ جس میں دس لاکھ سے زیادہ کمیونسٹ اور ان کے حامی تہ تیغ کیے گئے۔ چنانچہ وہاں بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا۔ جیسا کہ میں نے ''بنیاد پرستوں'' کا تصادم میں استدلال کیا ہے انہی قاتلوں نے اپنی تنظیمیں بنا لیں اور وہ ابھی تک وہاں سرگرم ہیں۔ جب آپ ایک خلا پیدا کر دیں گے، قوم پرستوں اور کمیونسٹوں کا صفایا کر دیں گے، تو جلد یا بدیر کوئی اس خلا کو پر کرے گا۔ انڈونیشیا میں یہ خلا بہت سی سرکاری اور غیر سرکاری مذہبی جماعتوں نے پر کیا۔ انڈونیشیا میں جو کچھ ہوا، میں سامراج کو

اس کا ذمہ دار قرار دیتا ہوں۔

آپ دیکھیں مشرقِ وسطیٰ میں کیا ہوا اور 1967 میں کس طرح ناصر کو شکست سے دوچار کیا۔ اسرائیل نے مصر، شام پر پیشگی حملہ کر دیا اور بڑے علاقے پر قابض ہو گیا۔ یہ ناصر پر کاری ضرب تھی۔ اس نے جنگ کے فوراً بعد استعفیٰ دے دیا۔ اور یہ مصر کی تاریخ کا دل گداز موڑ ہے۔ اس کے نتیجے میں لاکھوں لوگ سڑکوں پر سیلاب کی طرح ابل پڑے۔ وہ پرجوش نعرے لگا رہے تھے کہ مت جاؤ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ ناصر کے آنسو آ گئے اور اس نے استعفیٰ واپس لے لیا۔

لیکن چند سال بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کی جگہ سادات آیا، اس نے اسرائیل کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا اور اس کو سامراج کے جنگی رتھ میں جوت دیا گیا۔ ناصرازم اور بائیں بازو کو ختم کرنے کے لیے سادات نے اسلام پسندوں کو استعمال کیا کہ وہ یونیورسٹیوں میں گھس جائیں اور ایسے لوگوں کا صفایا کریں۔ سادات کے دور میں اسلام پسندوں کا اثر و رسوخ بڑھتا چلا گیا۔ ستم یہ کہ انہوں نے خود سادات کو لپیٹ لیا۔

> آپ نے 1965ء میں انڈونیشیا میں برپا ہونے والے انقلاب کا ذکر کیا ہے۔ جس کے نتیجے میں جنرل سوہارتو برسرِاقتدار آیا۔ تب سی آئی اے نے انڈونیشیا کی فوج کو مشتبہ بائیں بازو والے لوگوں کی فہرست مہیا کی تھی۔ فوج نے انہیں قتل کر دیا۔ یہ اس لحاظ سے دلچسپ بات ہے کہ 1963 میں عراق میں بھی یہی کچھ ہوا تھا۔

سی آئی اے ہر اس طاقت کو فہرست مہیا کرنے کو تیار تھی، جو کمیونسٹوں کا صفایا کر سکتی تھی۔ 1963ء میں انہوں نے عراق کی بعث پارٹی کو بھی فہرست مہیا کی تھی اور اس کی تصدیق اردن کے شاہ حسین نے بھی کی۔ سی آئی اے کے پرانے ایجنٹ کی حیثیت سے وہ انہیں جانتا تھا۔ مصر کا معروف صحافی اور ناصر کا دوست محمد حسنین ہیکل شاہ حسین پر برافروختہ تھا کہ شاہ نے اردن کو امریکہ کے تحفظ میں دے دیا ہے۔ جواب میں شاہ حسین نے کہا کہ یہ آپ کیا بات کر رہے ہیں۔ عراق کی بعث پارٹی کے بارے میں کیا خیال ہے؟ سی آئی اے نے انہیں کمیونسٹوں کی ایک فہرست دی ہے جنہیں وہ پھانسی دینے والے ہیں۔

تب ... انٹرنل سیکورٹی اپریٹس کا انچارج ... یہی صدام حسین تھا۔ اور تبھی اس کے امریکی انٹیلی جنس کے ساتھ تعلقات کا آغاز ہوا تھا۔ اس نے ہمیشہ امریکیوں کے بہت قریب

رہ کر کام کیا۔ تاہم جب کویت کی مہم ناکام ہوگئی تو وہ نام نہاد سامراج مخالف بن گیا۔ اس کا خیال تھا کہ امریکی اس عمل کی حمایت کریں گے۔ قاتلوں کو فہرستیں دینے کا سلسلہ نہ تو عراق میں شروع اور نہ ہی انڈونیشیا میں اختتام پذیر ہوا۔ لاطینی امریکہ میں امریکہ نے نہ صرف یہ کہ فہرستیں مہیا کیں بلکہ لاطینی امریکہ کے مخالف رہنماؤں اور گوریلوں کو اذیت دینے اور قتل کرنے میں خود بھی شریک ہوئے۔ فلپ ایگی (Agee) کی کتاب "Inside the Company" میں یہ کہانی قدرے تفصیل سے بیان کی گئی ہے اور اسی باعث اس نے استعفیٰ بھی دیا۔

اب بھی یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ البتہ دشمن بدل گئے ہیں۔ اب دشمن کیمونسٹ نہیں ہیں۔ وہ بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ اب ان کے دشمن پرانے اتحادی ہیں۔ جو کچھ گوانتاناموبے میں ہو رہا ہے۔ وہ پرانے طریق کار کا نیا انداز ہی تو ہے۔ دشمن بدل گئے ہیں مگر طریق کار وہی پرانا والا ہے۔

آپ نے لفظ ''بعث'' (Baath) کو ذومعنی انداز میں برتا ہے اور قرار دیا کہ 1963 میں یہ Blood Baath تھا۔ اس جماعت کے ممتاز راہنما احمد البکر نے کہا تھا کہ ''ہم امریکی گاڑی میں سوار اقتدار تک پہنچے ہیں۔''

وہ پوری طرح آگاہ تھے کہ وہ کس طرح اقتدار میں آئے ہیں۔ اس وقت امریکہ کی مخالفت کا مطلب بعث پارٹی کی حمایت کرنا یا کیمونسٹوں کو اقتدار میں لانا تھا۔ چنانچہ انہوں نے بعث پارٹی کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔ یہ ایک کھلا سوال ہے کہ امریکہ کی مدد سے بغیر کیا ہوتا؟ ہم نہیں جانتے کیا ہوتا، اور کوئی قیاس کرنا محض بے وقوفی ہے۔ اب جبکہ بعث پارٹی کو بھوت بنا دیا گیا ہے لوگوں کو یہ حقائق یاد آنے چاہئیں۔ بعث پارٹی کا آغاز ایک قوم پرست پارٹی کی حیثیت سے ہوا تھا۔ اور اس کے عراقی ونگ نے امریکہ کے ساتھ ایک سودا کیا تھا۔ اس پر شام کی بعث پارٹی نے عراق پر یہ الزام لگایا کہ وہ امریکہ کے جال میں آ گیا ہے۔ شام عراق کی دشمنی کا ایک سبب یہ بھی تھا، کہ عراق نے امریکی انٹیلی جنس کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی حامی بھر لی تھی۔ یہ اتحاد عراق کی بعث پارٹی کے لیے مفید تھا۔ وہ محض مٹی کے مادھو ہی نہیں تھے۔ اس سے انہیں بے پناہ مدد ملی۔

کیا اس بات کا ٹھوس ثبوت موجود ہے کہ شاہ حسین سی آئی اے کا ایجنٹ تھا۔

خیر، اسے ایجنٹ کہنا تو مبالغہ ہوگا۔ وہ ان کا تنخواہ دار نہیں تھا اور نہ ہی براہِ راست ان کے لیے کام کر رہا تھا۔ لیکن وہ سی آئی اے کے بہت قریب تھا۔ اور اس کا تعاون اور اتحاد تو شک وشبہ سے بالا ہے۔ اس نے 1970 میں فلسطینیوں کی تحریک کو کچل دیا تھا۔ اسرائیل اور امریکہ دونوں کی طرف سے ایسا کرنے کو کہا گیا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اردن میں موجود فلسطینیوں کے کیمپ شاہ حسین کے لیے بھی خطرہ ہیں اور خود ان کے لیے بھی۔ وہاں آبادی کی اکثریت فلسطینیوں پر مشتمل ہے، پھر اردن کا ایک بڑا حصہ پہلے فلسطین ہی تو تھا۔ فلسطین کے کچھ حصے شاہ حسین کے والد شاہ عبداللہ نے صیہونیوں کو بیچ دیئے تھے، جس کے نتیجے میں اسے قتل بھی کر دیا گیا تھا۔ یہ ایسا اتحاد ہے جس کی جڑیں بہت پیچھے تک جاتی ہیں۔ شاہ حسین نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اس کی بقا نہ کہ اردن کی بقا اسی میں ہے کہ اردن کو امریکی اسرائیلی تحفظ میں دے دیا جائے۔ اور اس نے ایسا ہی کیا، اور آج بھی اردن کی حیثیت یہی ہے۔

اس سلسلے میں 1970ء کا سیاہ ستمبر ایک فیصلہ کن موڑ تھا۔ تب شاہ حسین نے فلسطینیوں کو کچل دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ اس ''نیک کام'' کے لیے جس پاکستانی بریگیڈیئر کو چنا گیا وہ نام نہاد اسلام پسند ضیاالحق تھا۔ پاکستانی حکومت نے اس کام کے لیے ضیاالحق کو بھیجا تھا۔ ضیا نے فلسطینیوں کے قتل عام کا انتظام کیا جس کے لیے فلسطینیوں نے اسے کبھی معاف نہیں کیا۔ میرے البم میں ایک نہایت دردانگیز تصویر ہے، یہ تصویر فلسطینیوں کے کیمپوں کو تباہ کرنے اور اردن میں مزاحمت کو کچلنے کے بعد اردن کے فوجی میس میں منعقدہ ایک تقریب کی ہے۔ بریگیڈیئر ضیا اور شاہ حسین کی فوج کا ایک افسر مل کر ناچ رہے ہیں۔ اردنی افسر نے ٹوپی رکھی ہے، ضیا نے ایک یا دو پیگ لیے ہوں تو پتہ نہیں۔ بعد میں بلاشبہ اس نے ایک متقی مسلمان کا روپ اختیار کر لیا۔ تاہم میں فلسطین میں اس کے کردار کو کبھی نہ بھلا سکا۔

میں نے بے نظیر سے کہا تھا، کہ ''یہ شخص تمہارے والد کا تختہ الٹ دے گا۔ یہ شخص پاکستانی سیاست کا Uriah Heep (ڈکنس کے ناول کا کردار) ہے۔ تمہارے سامنے یہ بڑی لجاجت کرتا ہے، غلام سرشت اور چاپلوس نظر آتا ہے، لیکن اس کے ذہن میں اور ہی منصوبہ ہے۔''

یہ سب جنوری 1977ء میں پاکستان سے واپسی پر کہا تھا۔ یہ بات بے نظیر بھٹو کے والد

MashalBooks.com

ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ اختلافات پیدا ہو جانے کے بعد کی ہے۔ تب وہ آکسفرڈ یونین میں تھی اور اس نے مجھے تقریر کے لیے بلایا تھا۔ اس نے مجھے کہا، ''آج میرے والد کا فون آیا تھا، وہ پوچھ رہے تھے کہ میں ان کے دشمنوں کو دعوت کیوں دے رہی ہوں؟'' میں نے جواب دیا کہ وہ ہمیشہ بچپنا اور حماقت دکھاتے ہیں۔ اس کے جواب میں بے نظیر نے کہا، ''میں جانتی ہوں مگر میرے والد نے مجھے کہا ہے کہ اگر میں نے تمہیں بلا ہی لیا ہے تو اس پر تقریر ہونی چاہیے کہ پاکستان میں کیا ہونے والا ہے۔'' میں نے کہا کہ میں یہ گفتگو کبھی نہیں بھولوں گا۔ میری طرف سے اپنے والد کو بتا دو کہ یا تو انہیں قتل کر دیا جائے گا یا فوجی انقلاب آئے گا۔ اور اس نے کہا کہ قتل تو کسی سے نہیں رکا۔ البتہ فوجی انقلاب نہیں آ سکتا کیونکہ ضیاء ہماری جیب میں ہے۔'' تب اس نے جیب کا اشارہ بھی دیا۔ میں نے کہا، ''بے نظیر، اپنے والد کو بتا دو کہ کوئی پاکستانی جنرل کبھی کسی سویلین کی جیب میں نہیں ہوتا۔'' تین ماہ بعد جنرل ضیا نے تختہ الٹ دیا۔ بھٹو سے وزارت عظمیٰ چھن گئی اور بعد میں جان بھی۔

> 1950ء کی دہائی میں بنڈونگ کے جذبے کے ساتھ نوآبادیاتی نظام کے خاتمے کے بعد ان ممالک سے بہت سی تصانیف منظر عام پر آئیں۔ غرب الہند کے جزیرہ ٹرینی داد میں "The Black Jaocobians" کا مصنف سی ایل آر جیمز ذرا پہلے ان کی نظیر دے گیا تھا۔ لیکن بعد میں Aime Cesaire،Frantz Fanon اور Amilcar Cabral آئے۔ آج کے سامراج مخالف نظریہ ساز کون کون سے ہیں جنہیں پڑھا جا رہا ہے؟

میں آپ کی فہرست میں انڈونیشیا کے مصنف Pramoodya Ananta Toe کا اضافہ کروں گا جس نے بعض نہایت شان دار فکشن اور دیگر کتب لکھیں اور اپنی زندگی کا زیادہ حصہ انڈونیشیائی جرنیلوں کی سخت قید میں رہا۔ وہ ابھی زندہ ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ نوبل پرائز برائے ادب کا حق دار ہے۔ لیکن انعام دینے یا نہ دینے کے معیارات پر غور دلچسپ کام ہے۔ متعلقہ کمیٹی کی ایک آنکھ ہمیشہ انتظامیہ کی رضا پر ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر سوویت یونین کے زوال کے بعد کسی روسی کو نوبل پرائز برائے ادب نہیں دیا گیا۔ پاکستان میں فیض احمد فیض جیسے شاعر ہیں اور بھارت میں کئی قلم کار ہیں جو آج کے سامراج مخالف نظریہ ساز ہیں۔ اس دنیا میں ویسے لوگ تلاش کرنا بہت مشکل ہے جن کا ذکر آپ کر رہے ہیں۔

ایسا کیوں ہے؟

1989ء میں سرمایہ داری کی فتح اور سامراج مخالف تحریکوں کے زوال کے بعد حوصلے دم توڑ گئے دنیا کے اس حصے میں دانشوروں نے پسپائی اختیار کر لی۔ عرب دنیا میں صورت حال ویسی مایوسانہ نہیں رہی۔ لیکن وہاں کبرال، سیزر، فینن یا طور جیسے دانشور موجود نہیں ہیں۔ البتہ عرب شعرا اپنی قوم کی آواز بن گئے ہیں۔ جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں، نزار قبانی، سعدی یوسف، مظفر النواب جیسے شعرا نے وہی کردار ادا کیا جو 1940 اور 1950 کے عشروں میں نوآبادیاتی نظام کی ابتدا اور اس کے خاتمے کے بعد دانشوروں نے ادا کیا تھا۔

> ہم نے شعرا کا ذکر کیا ہے، لیکن ان کا بھی تو ذکر ہو جائے جو سامراج کے طنبورے تھے۔ رڈیارڈ کپلنگ جس نے ''سفید آدمی کا بوجھ'' کی اصطلاح ایجاد کی تھی۔ اس کے ارتقا کی کہانی دلچسپ ہے۔ اس کا بیٹا پہلی جنگ عظیم میں جان گنوا بیٹھا۔ تب اس نے Epitaphs of the War لکھی۔ میں آپ کو دو سطریں سنانا چاہوں گا، ''اگر کوئی سوال کرے کہ ہم مر کیوں گئے؟ انہیں بتاؤ کیونکہ ہمارے بزرگوں نے جھوٹ بولا تھا۔'' ایک اور نظم، جس کا نام ''مردہ سیاست دان'' ہے، میں وہ لکھتا ہے:
>
> نہ محنت کا یارا تھا نہ ڈاکے کی جرأت
> سو لوگوں کے خوش کرنے کو جھوٹ بولا
> اب کہ سب جھوٹ کھل چکے
> اور مجھے اپنے مقتولوں کا سامنا ہے
> اب کون سی کہانی کہوں کہ فریب خوردہ بچوں کی تسلی ہو

بہت خوبصورت سطریں ہیں اور عراق میں جنگ پر پوری طرح منطبق ہوتی ہیں۔ ان نوجوانوں پر، جنہیں بلیئر اور بش نے موت کے منہ میں دھکیل دیا۔ ان دسیوں ہزار عراقیوں پر جنہیں قتل کر دیا گیا، یہ سطریں پوری طرح منطبق ہوتی ہیں۔ میں کپلنگ کی اس نظم کو بے حد پسند کرتا ہوں اور میں نے یہ سطریں جنگ کی مارا ماری میں اپنی ایک تقریر میں استعمال کی تھیں۔ کپلنگ ایک عجیب آدمی تھا وہ ایک برطانوی حکمران خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ

MashalBooks.com

برطانیہ کے وزیراعظم سٹینلے بالڈون کا رشتہ دار تھا۔ بالڈون سلطنت کے ایک نہایت فیصلہ کن موڑ پر اقتدار میں آیا اور پوری طرح سراہا نہ گیا۔ کپلنگ کے بارے میں بریخت (Breacht) نے بڑی حیرت انگیز نظم لکھی ہے۔ بریخت ہم میں سے اکثر کی طرح کپلنگ کی سیاست کو ناپسند کرتا تھا۔ لیکن ساتھ ہی اس کی شاعری کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا۔

نائپال کی قسم کا؟

واقعی نائپال سے مشابہ۔ پہلی جنگ عظیم میں ہونے والی اموات کے بارے میں اس نے بڑی حیرت انگیز نظم لکھی۔ وہ ملکہ وکٹوریہ کے آخری دنوں کی بات کرتا ہوا اپنی نفریں کو یوں بیان کرتا ہے:

''اوہ، مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب''
ان کے اجرتی بھانڈ چلّائے
مگر میں نے غور سے دیکھا
اس خلیج پر بنے پل کو
اور مشرق پر گولے برساتی توپوں
اور انہیں مانجھنے والے سپاہیوں کو
اور مشرق سے مغرب کو آتی
خون میں لتھڑی چائے اور جنگ میں خونم خون سونا

یہ ایک عمدہ نظم ہے۔ بریخت نے کپلنگ کی بہت سی نظموں کا جرمن میں ترجمہ کیا اور انہیں اپنے ڈراموں میں گیتوں کے طور پر استعمال کیا۔ کپلنگ بڑا دلچسپ آدمی ہے۔ ممکن ہے کہ وہ واحد امپیریلسٹ ناول نگار رہا ہو۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ اس کے بعض پہلوؤں کا ناقد بھی رہا۔ سلطنت کے دورِ عروج میں وہ واحد قلم کار تھا جسے عام برطانوی کے لہجے پر عبور حاصل تھا۔ وہ ہندوستان میں قابض انگریزوں کا گائیک اور ترجمان تھا۔ چنانچہ ہندوستان میں سامراج کے نمائندوں کا اعلیٰ طبقہ اس کے کام کو ناپسند کرتا تھا۔ اس لیے نہیں کہ ہندوستان نواز تھا، بلکہ اس لیے کہ وہ نچلی سطح کے انگریزوں کی وکالت کرتا تھا جنہیں سامراج کی خدمت پر مجبور کر دیا گیا تھا۔

یہ نظم جو آپ نے پڑھی، بجائے خود تاریخ ہے۔ میرا خیال ہے کہ کپلنگ جانتا تھا کہ بیٹے کی موت کا الزام فقط جھوٹے سیاست دانوں پر نہیں بلکہ خود اس کے سر بھی آتا ہے۔ کپلنگ کے بیٹے کی نظر بے حد کمزور تھی اور فوج میں شمولیت کے آڑے آ رہی تھی۔ لیکن کپلنگ نے برطانوی سوسائٹی میں اپنے اثر و رسوخ کو استعمال کیا، اور جیسا کہ لوگ کہتے ہیں کہ اپنے بیٹے کی معذوری کو نظر انداز کرتے ہوئے فوج میں اس کی شمولیت کے لیے اس نے بڑے بڑے لوگوں سے سفارش کروائی۔ وہ فوج میں شامل ہوا ہی تھا کہ ایک لڑائی میں مارا گیا۔ اس کے ساتھی فوجی نے بتایا کہ وہ محض اس وجہ سے مارا گیا کہ اس کا چشمہ گر گیا تھا، اور اسے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ جب کپلنگ نے یہ سنا تو اجڑ کے رہ گیا۔ یہ نظم اپنے آپ سے اس کی تلخی اور غصے کو ظاہر کرتی ہے۔ وہ جانتا تھا کہ جارحیت پسندی اور جنگ کی حمایت نے اسے راغب کیا کہ وہ اپنے بیٹے کو موت کے منہ میں دھکیل دے۔

کپلنگ کی معروف ترین نظموں میں سے ایک "On the Road to Mandalay" ہے۔ وہ لکھتا ہے، ''مجھے کہیں سویز کے مغرب میں بھجوا دو جہاں بہترین بھی بدترین جیسا ہے۔ جہاں احکام عشرہ موجود نہیں۔ اور وہاں انسان اپنی ہوس کو بڑھا سکتا ہے۔'' اپنی اس نظم میں وہ مشرق کو یوں بیان کرتا ہے گویا یہ خالی زمین ہے یا فقط نفسانیت کا گڑھ جہاں جانے والے سفید فام کو عورتیں اور خزانے ملیں گے اور جادو کے چراغ اور اڑتے قالین جیسے عجائبات ہاتھ لگیں گے۔

ہم نے دیکھا کہ مشرق کے متعلق پیدا ہونے والی یہ ندرت کارگر رہی۔ انہیں واقعی یہی کچھ نظر آتا تھا کیونکہ انہیں زیادہ عمیق نظر کی تربیت ہی نہ دی گئی تھی۔ بنظر انصاف دیکھا جائے تو کپلنگ کے پاس یہ صلاحیت موجود تھی مگر بیشتر اس سے عاری تھے۔ وہاں حظ اٹھانے کو صرف عورتیں نہ تھیں بلکہ مرد بھی میسر تھے۔ اس جہان میں ہر عمر کے لڑکے فوراً دستیاب ہو جاتے اور اسے کچھ ایسا معیوب بھی نہ سمجھا جاتا۔ کپلنگ کی بعض کہانیوں میں اس کی اپنی دلچسپیاں اور مفاد سلطنت کے مفادات کا تتمہ بن کر رہ جاتے ہیں۔ مثلاً اس کی کہانیوں میں نظر آنے والے بنگالی کالے اور ٹھگنے ہوتے ہیں اور کلرکانہ سوچ کا اظہار کرنے کے لیے مسلسل بولتے ہیں۔ چونکہ بنگالیوں نے انگریزی فوراً سیکھ لی تھی چنانچہ انگریز ان سے خطرہ محسوس کرتے تھے۔ بہت اوائل میں بنگالیوں نے خاصا علم حاصل کیا اور ایک دانشور طبقہ بھی وجود میں آیا۔ انگریزوں کو اس طرح کا خطرہ برصغیر کے کسی اور حصے میں نظر نہیں آتا تھا۔ معروف

ہندو مصلح راجہ رام موہن رائے کہا کرتا تھا، ''جو چیز بنگال آج سوچتا ہے، ہندوستان اگلے دن سوچتا ہے۔''

بہت زیادہ سوال کرنے والا بلکہ کچھ زیادہ ہی سوال کرنے والا، کچھ زیادہ ہی سوچنے والا اور کچھ زیادہ ہی باتیں کرنے والا بنگالی انگریزوں کو کیوں کر بھاتا۔ پنجابی جاٹوں کی صورت انہیں مارشل ریس (Marshal Race) کی خوبصورتی بھا گئی اور ظاہر ہے کہ پٹھان بھی پسند آئے جو انہیں سکندر کے قبائل کی اولاد لگے۔ چھ فٹ قد، صاف رنگ، سرخ بال اور نیلی آنکھوں والے پٹھان جو شمال مغربی ہندوستان میں بستے تھے اور جہاں ہم جنسیت روزمرہ زندگی کا حصہ تھی۔ یہاں ذوجنسیت عام تھی۔ نسل کشی کے لیے عورت اور لذت کے لیے لونڈے۔ کپلنگ اور بہت سے انگریز منتظمین کو یہی بات بھا گئی۔ مجھے خبر نہیں کہ اس کے کوئی شواہد ملتے ہیں کہ نہیں، لیکن خیال آتا ہے کہ خود کپلنگ بھی ہم جنس پرست ہوسکتا ہے۔ اس کی بعض کہانیوں میں نظر آنے والی شدت ایسی ہی ششدر کن ہے۔ قریب قریب ایسا لگتا ہے گویا وہ بھی کسی کے ساتھ ملوث ہے۔ پال سکاٹ کے ناول ''Raj Quartets'' کے کردار رونالڈ میرک کا سا معاملہ ہے جو ہندوستان کی طرف کھنچتا بھی ہے اور اس سے نفرت بھی کرتا ہے۔

ایڈورڈ سعید کے پسندیدہ ناول نگاروں میں سے ایک پولینڈ نژاد اور "Heart of Darkness" کا مصنف جوزف کانرڈ ہے جس پر بعد ازاں فرانسس فورڈ کو پولا نے "Apocalypse Now" نامی فلم بنائی۔ اس ناول کی کچھ سطریں یہ ہیں: ''وہ کانگو میں بلجیئوں کے کرتوت جانتا تھا اور یہ بھی کہ باقی افریقہ میں کیا ہو رہا ہے۔ لندن کو بیان کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ یہ دنیا کا عظیم ترین شہر ہے۔ اس کا کردار مارلو دریائے ٹیمز میں لنگر انداز کشتی نیلی (Nellie) میں بیٹھا ہے۔'' لندن کے بارے میں اگلی ہی سطر میں اس کا مشاہدہ یہ ہے کہ ''یہ دنیا میں موجود چند تاریک جگہوں میں سے بھی ایک ہے۔''

برطانوی کلچر میں کانرڈ ہمیشہ ایک غیر ملکی کی حیثیت سے رہا۔ اس طرح کی دوئی کانرڈ کی شخصیت میں بھی موجود تھی۔ پولینڈ میں پیدا ہونے والے کانرڈ نے جہازوں پر ملازمت کی۔ انگریزی بہت بعد میں سیکھی اور اس پر کامل دست گاہ حاصل کی۔ اس کا معاملہ بھی Issac Deutscher کا سا ہے۔ وہ بھی پولینڈ سے نکلا تو انگریزی سے بے بہرہ تھا۔ حالانکہ دونوں میں زمانہ کا فرق ہے اور بہت مختلف شخصیت کے حامل ہیں۔ لیکن میرے ذہن میں اکثر اکٹھے آ

جاتے ہیں۔ دونوں کا تعلق پولینڈ سے تھا اور دونوں انگریزی کے استاد نثار بنے۔ ڈیوٹشر نے تین جلدوں میں ٹراٹسکی کی سوانح لکھی جو سیاست سے قطع نظر بہت خوبصورت تحریر ہے اور کانرڈ کی تحریریں بھی اتنی ہی ششدر کن ہیں۔ دونوں میں یہی امر مشترک ہے کہ انگریز نہیں ہیں اور اسی لیے ان کی تحریریں ششدر کن ہیں۔ یعنی دونوں بڑے خاص انداز میں انگریزی لکھتے ہیں۔ ولیم بلیک کو لندن بڑے تاریک کونوں کھدروں کا حامل شہر لگا۔ بعد میں آنے والے کانرڈ نے بھی یہی محسوس کیا۔ ظاہر ہے کہ یہ شہر نوآبادکاری کے ساتھ وابستہ تجارت، لوٹ مار اور سامراجی قوت کے شہر تھے اور یہ چیزیں شہر کے باسیوں پر بھی اثر ڈالتی تھیں۔

میں ابھی سکول میں تھا کہ مجھے اس کی کہانی ''The Secret Agent'' پڑھنا پڑی۔ یہ ہمارے نصاب میں شامل تھی۔ میرے زیر مطالعہ آنے والی کانرڈ کی یہ پہلی تحریر تھی۔ اس کا ایک پہلو تو مذہب تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کا مطالعہ ایک اور طرح سے بھی ہو سکتا تھا۔ یہ انارکسٹ یہاں کیوں موجود ہیں اور جو کچھ کرتے ہیں کیوں کرتے ہیں؟ لیکن اس کہانی کو اس طریقے سے کوئی نہیں پڑھتا تھا۔ اس طرح کی دوئی کانرڈ کے ہاں ہمیشہ موجود رہی اور وہ خود اس کی تجسیم تھا۔ جدید ادب کی طاقتور ترین سطور میں سے ایک کا تعلق ''Heart of Darkness سے ہے۔"The Horror! The Horror!"۔ تب کانرڈ کانگو کے بارے میں لکھ رہا تھا جو ذاتی کالونی کے طور پر بادشاہ لیوپولڈ کو ملی تھی۔ کچھ عرصہ بادشاہ کی جائیداد رہنے کے بعد یہ بیلجیئم کو مل گئی۔ کانرڈ نے کانگو میں نوآبادکاری کی بربریت پر لکھا اور اس اعتبار سے وہ اکیلا مصنف نہیں ہے۔ ایک قطعی مختلف پس منظر سے تعلق رکھنے والے مصنف سر آرتھر کونن ڈائل کو بھی کانگو کا ہوکا تھا۔ وہاں ہونے والے ظلم و تشدد پر اس کی تحریر بھی بہت بکی۔

ایڈم ہوک چائلڈ کی کتاب "King Leopold's Ghost" میں یہ سب کچھ بیان کیا گیا ہے اور اسے سامراجی سلطنتوں اور تاریخ عالم میں ایک اہم اضافہ سمجھا جاتا ہے۔ کتاب میں بتایا گیا ہے کہ کانگو میں کوئی دس بارہ ملین لوگ مارے گئے۔ یہ تعداد ظلم و ستم کا اندازہ کرنے کے لیے کافی ہے۔ یہ تاریک عہد انیسویں صدی کے اواخر میں شروع ہوا اور اس میں بیسویں صدی کا سب سے بڑا قتل عام ہوا۔ اسے دوسری جنگ عظیم میں یہود کشی کا پیش رو سمجھنا چاہیے جس میں کوئی چھ ملین یہودی قتل ہوئے تھے۔ ان سب چیزوں کو الگ الگ دیکھنے کی بجائے ایک تناظر کے طور پر دیکھنا چاہیے۔

MashalBooks.com

"Heart of Darkness" میں یہ لفظ کرٹز (Kurtz) نے کہے تھے، "The Horror! The Horror!" ناول میں کرٹز ایک عجیب اور خبطی شخص دکھایا گیا ہے۔ اسے بھی یہ خوفنا کی نظر آتی ہے اور وہ اس میں کسی حد تک حصہ بھی لیتا ہے۔ کوپولا نے ویت نام میں مارلن برانڈو کو کرٹز کا روپ دیا جو میرے خیال میں اس فلم کا کمزور ترین حصہ ہے۔ فلم کے پہلے تین حصے جنگ خلاف جذبات سے لبریز ہیں۔ لیکن پھر وہ برانڈو کے ساتھ بربّریت کے راستے پر چل نکلتا ہے اور ویت نام کے پہاڑی قبائل میں جا پہنچتا ہے۔ اس میں کچھ ایسی بربّریت تو نہیں سوائے اس کے کہ سلطنت ان قبائل کو استعمال کر رہی ہے۔ اس نے تو فلم کو کمزور کر دیا۔

> "Heart of Darkness" میں کانرڈ لکھتا ہے، ''وہ فاتحین تھے، جو بننے کے لیے فقط وحشیانہ قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ فقط تشدد سے بھرپور ڈکیتی، بڑے پیانے پر قتل عام اور اس میں مصروف اندھا دھند لوگ اور علاقوں کی فتح جو زیادہ تر لوگوں کے لیے ان لوگوں سے زمین چھیننے کا عمل ہے جن کا رنگ آپ سے مختلف ہے یا ناک ہماری ناک سے قدرے کم ہے۔ اسے زیادہ غور سے دیکھو تو کوئی دلفریب چیز نہیں۔ اس میں آئیڈیے سے جان پڑتی ہے۔'' اس وقت گورے نے انسان کو 'مہذب' بنانے کا ٹھیکہ لیا تھا۔ لیکن آج یہی خیال برائی کا محور، دہشت گردی کے خلاف جنگ اور انسانی بنیادوں پر مداخلت کا روپ دھار چکا ہے۔ ذرا سامراجیت کی نئی اصطلاحات پر بات ہو جائے۔ آپ ہمیشہ سے بلقان میں امریکی و برطانوی مداخلت پر تنقید کرتے چلے آئے ہیں۔''

سرد جنگ ماضی کا حصہ بنی تو امپائر کے تجزیہ نگاروں نے بلقانی جنگوں اور عراق پر حملے کے درمیان موجود تسلسل کا تجزیہ شروع کر دیا۔ تسلسل تو بہرحال موجود ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ انسانی بنیادوں پر مداخلت کے اس دعوے کے متعلق یورپ اور شمالی امریکہ کے شہری بہت سنجیدہ ہیں۔ وہ واقعی یہ مان لینا چاہتے تھے کہ ان کی حکومتیں خیر کے لیے جنگ میں کودی ہیں۔ اور چونکہ وہ مان لینا چاہتے تھے چنانچہ انہوں نے مان لیا۔ انہیں معاملے کا کوئی دوسرا پہلو نظر ہی نہیں آیا اور نہ وہ دیکھ سکتے تھے۔ پہلے بھی بات ہوئی ہے کہ اگر انہیں نیکی ہی کرنا تھی تو پھر انہوں نے روانڈا میں مداخلت کیوں نہ کی جہاں واقعی نسل کشی ہو رہی تھی اور اقوام متحدہ کی مداخلت سے دسیوں ہزار لوگوں کو بچایا جا سکتا تھا۔ تب اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل بطرس غالی قدرے آزاد ذہن شخص تھا۔ اس نے یہ نکتہ اٹھایا تو امریکہ اس کی جگہ کوفی عنان کو لے آیا۔

عنان نے خود اپنے براعظم روانڈا میں مداخلت کی بجائے بلقان میں مداخلت کی دل و جان سے حمایت کی۔

یہی وجہ ہے کہ امریکہ اور برطانیہ نے عندیہ دیا کہ جو کچھ بلقان میں ہو رہا ہے قتل عام ہے۔ چونکہ انہیں خبر تھی کہ حقیقی نسل کشی تو روانڈا میں ہو رہی ہے جبکہ بلقان کے وقوعات ناخوشگوار، گندی اور مکروہ خانہ جنگی تھی جو یوگوسلاویہ کی تقسیم کے سبب چھڑی۔ اس خانہ جنگی کو یورپی قوتوں اور بالخصوص جرمنوں کی حمایت حاصل تھی جن پر ان وقوعات کی بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ جب آپ کسی ملک کو تقسیم کرتے ہیں تو وہاں کی آبادیوں کو نقل و حمل سے گزرنا پڑتا ہے۔ یا پھر وہ ڈر کر دوڑ لگا دیتے ہیں۔ 1947ء میں پاکستان اور ہندوستان میں بھی یہی کچھ ہوا تھا۔ جب ہر طرف لوگ مرتے ہیں تو کسی ایک کو برا اور کسی دوسرے کو اچھا کہنا مفید نہیں ہوتا۔ سلووانیا اور کروشیا کو الگ کرنے کا فیصلہ جرمنی کے دفتر خارجہ میں ہوا تھا۔ ملاسووچ بھی ذمہ داری سے بری نہیں۔ بوسنیا میں ہونے والے ہولناک جرائم کرادچ (Kradic) اور تجمان (Tudjman) جیسے کٹر کروشیائی مذہب پرستوں کی کارگزاری بھی تھی۔ موسٹر کی تباہی اور کراجنی سربوں کا دیس نکالا بھی ایسے تھے۔ اور سربیریڈیکا کا قتل عام بھی نا قابل فراموش اور نا قابل معافی ہے۔ لیکن یورپیوں نے بلقان کی کمزوری کا فائدہ اٹھا کر انہیں تقسیم کیا اور خوفناک نتائج برآمد ہوئے۔ اب بوسنیا اور کوسووو میں دو پروٹیکٹوریٹ ہیں۔ ایک اقوام متحدہ کا اور دوسرا امریکہ کا۔ اور صورتحال بہت بری ہے۔ کیا حاصل ہوا۔ انسانی بنیادوں پر مداخلت کرنے والے اب بوسنیا اور کوسووو کی بات نہیں کرتے۔ ان کا مفاد ختم اور وہ آگے چل نکلے۔ فلپ بوبٹ (Phillip Bobbit) کلنٹن کی نیشنل سیکورٹی کونسل میں ہوا کرتا تھا۔ وہ اپنی کتاب "The Shield of Achilles" میں کہتا ہے کہ کلنٹن اور بش کے درمیان بھی تسلسل موجود ہے۔ وہ بلقان میں مداخلت کو اپنی کوششوں کا ثمر بتاتا ہے اور قرار دیتا ہے کہ یہ عمل براہِ راست امریکی مفاد میں تھا۔ اب امریکی اڈے وہاں موجود ہیں اور ہم نیٹو کو وسعت دے سکتے ہیں۔ تو یوں ہے کہ بلقان کی جنگ نیٹو کی توسیع کی جنگ تھی۔ اس کا مقصد ثابت کرنا تھا کہ نیٹو کا کردار اب بھی موجود ہے۔ دوسرا مقصد روس کا محاصرہ تھا اور اس میں بھی کامیابی ہوئی۔ اس نے بطور عالمی طاقت روس کو بہت کمزور کر دیا ہے۔ اور امریکی مداخلت کا بنیادی مقصد ہی یہی تھا۔ انسان دوستی پر مبنی عزائم کا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ انسان دوستی کی بنیاد پر مداخلت کے کچھ علمبرداروں کو عراق میں جنگ پر اعتراض تھا۔ کیوں؟ وہی دلائل یہاں بھی استعمال ہو سکتے

ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ یہ گھس پٹ چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان لوگوں کی سادہ لوحی ہے کہ یہ سلطنت سے کسی ایسے عمل کی توقع کرتے ہیں جس میں اس کا اپنا مفاد نہیں۔

آیئے! سلطنت کے اس معبد میں ایک رخنے ''ارجنٹائن'' پر بات کرتے ہیں۔ یہ ملک کئی طرح سے استثنائی ہے۔ اونچی شرح خواندگی، تربیت یافتہ اور سلجھی ہوئی افرادی قوت اور وافر قدرتی وسائل۔ یوں ارجنٹائن کو نوآزاد خیالی کی علامت کے طور پر پیش کیا جا سکتا تھا۔ اس نے عالمی بینک اور آئی ایم ایف سے سرموانحراف نہ کیا اور تاریخ میں کسی بھی ملک کے لیے ممکن عظیم ترین اقتصادی انہدام کا شکار ہوا۔

ارجنٹائن خود کو لاطینی امریکہ میں ایک طرح کا یورپ سمجھتا تھا۔ یوں اس ملک میں مقامی آبادی قریب قریب ختم کر دی گئی تھی۔ چارلس ڈارون نے اپنی ڈائریوں میں اس کا ذکر کیا ہے۔ وہ اپنی کتاب ''اصل الانواع'' کے لیے دنیا کے طویل بحری سفر پر روانہ ہوا تو یہاں بھی آیا۔ یہاں ہوتے قتل عام دیکھ کر اسے شدید دھچکا لگا۔ وہ انسانی ارتقا کا عالم تھا اور یہاں اسے انسان جانوروں کا رویہ اپنائے نظر آئے۔ یہ لاطینی امریکہ کا واحد ملک ہے جہاں مقامیوں کو مکمل طور پر ختم کر دیا گیا تھا۔ پھر یہاں یورپ سے لوگ لا کر بسائے گئے۔ زیادہ تر اٹلی سے آئے اور کچھ سپین اور دیگر ممالک سے۔

ڈومینگو سرمانٹو نے ایک حیران کن کتاب ''Facundo'' لکھی جس میں اس ملک کی خانہ جنگیوں کا احوال درج ہے اور اس بربریت کا بھی جنہیں ارجنٹائنیوں نے صرف مقامیوں پر ہی روا نہیں رکھا بلکہ ایک دوسرے پر بھی آزمایا۔ اس نے اپنی کتاب میں دو رُجحانات کا ذکر کیا ہے۔ ایک گاچو (Gaucho) اور دوسرا یورپی۔ یورپی تہذیب آور ہے جبکہ دوسرا مقامی بربریت کا علمبردار۔ بہت دلچسپ اور بڑی خوبصورت لکھی گئی کتاب ہے۔

ارجنٹائن اور اس کا روشن فکر طبقہ خود کو یورپی گردانتا تھا۔ بیونس آئرس آپ دیکھیں تو یہ کسی یورپی شہر کے ڈیزائن پر بنا لگتا ہے۔ بڑا حیران کن شہر ہے۔ بہت بڑے بڑے پارک اور کھلے ایونیو۔ ارجنٹائن میں یقیناً ایک نوع کی نرگسیت موجود تھی اور وہ خود کو باقی لاطینی امریکیوں سے برتر سمجھتے تھے۔ اگرچہ انہوں نے اس دعوے کو کھلے الفاظ میں بیان نہ کیا اور نہ ہی اس کی وضاحت یا منطق دی لیکن ان کا ایقان یہی تھا۔ بالائی سے لے کر بہت کم تر طبقوں تک سب ارجنٹائنی اس اقتصادی بحران کے سبب نفسیاتی بحران سے دوچار ہوئے۔

اس دوران میں ارجنٹائن گیا اور کچھ دوستوں نے مجھ سے کہا، ''ہم تمہیں کچھ دکھاتے ہیں

جو اس ملک میں پہلے کبھی نہیں ہوا۔ لیکن تمہیں آدھی رات ہونے کا انتظار کرنا پڑے گا۔'' ہم کیفے میں چلے گئے اور آدھی رات کے بعد پھر ہوٹل میں آئے، ہمیں مضافات سے آئے بچوں کا ہجوم نظر آیا۔ انتہائی منظّم یہ بچے دستانے چڑھائے شہر کے مرکز میں آ گئے تھے۔ انہوں نے کوڑا دان خالی کیے اور ان میں موجود کوڑے کو چن لیا۔ میرے دوستوں نے کہا، ''ہم نے ارجنٹائن میں یہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔''

یہ وہ ملک ہے جس کے حکمرانوں نے آئی ایم ایف، عالمی بینک اور امریکی محکمہ خزانہ کی پیروی بڑی توجہ سے کی۔ ان اداروں کی مسلسل مداخلت نے اس ملک کو منہدم کر دیا۔ یہ نولبرل اقتصادیات کا انہدام تھا اور اسی نے ہر سطح پر مقامی جمہوریت کو جنم دیا۔ میں نے دیکھا کہ لوگ مقامی سطح پر ملکی مستقبل کے معاملات طے کرنے کے لیے اکٹھے ہوتے ہیں۔

یہیں حقیقی المیہ بھی موجود ہے۔ کئی سطح پر مقبول عام اقدامات کیے گئے لیکن ارجنٹائن کے لیے نولبرل اقتصادی نظام کا متبادل نہ مل سکا۔ یہی وہ شے ہے جسے ورلڈ سوشل فورم کے نظریہ ساز فروتر جانتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ ارجنٹائن منہدم ہوا اور انہی کے خیالات کا حامل عیسٹر کرچنز ملک کا صدر ہے۔ لیکن نچلی سطح پر اٹھنے والی تحریکوں کا کیا بنا۔ ان کے رہنماؤں پر کیا بنی۔ ان لوگوں نے سامنے آ کر کوئی متبادل نظام کیوں نہ پیش کیا۔ ان میں سے بہت سے کہتے ہیں کہ ہم سیاسی متبادل لئے اوپر نہیں آنا چاہتے۔ یہی چیز مہلک ہے۔ کیونکہ اگر آپ سیاسی متبادل تشکیل نہیں دیتے تو وہی نظام لوٹ کر پھر واپس آ جائے گا۔ میں نے یہ بات اپنے ایک ارجنٹائنی دوست کو بھی بتائی تھی۔ ایس (s) سے بننے والے لفظ سوشلزم کا استعمال خوف انگیز ہے اور یہ حماقت ہے۔ ہمیں ایک بار پھر اسے لوگوں کے سامنے لے جانا ہوگا کیونکہ یہی واحد متبادل ہے۔ ظاہر ہے کہ غلطیوں سے سبق لینا چاہیے اور انہیں دہرانا نہیں چاہیے۔ کیا وجہ ہے کہ اپنی تاریخ میں سرمایہ داری درجنوں بار ناکام ہوئی اور بار بار آگے آتی رہی؟ سوشلزم صرف ایک بار ناکام ہوا اور ہم اسے دوسرا موقع نہیں دینا چاہتے۔

ہمیں غیر سرمایہ دارانہ اقتصادی نظریات کو وضع کرنا ہوگا۔ یہ نظام یعنی سوشلزم بڑے پیمانے کی ریاستی مداخلت کا علمبردار ہے۔ ہمیں ایک مختلف نظام تشکیل دینا ہوگا جس میں لوگ ہر سطح پر کارفرما ہوتے ہیں۔ یہ نظام سوویت یونین کے نظام جیسا نہیں ہوگا۔ بلکہ یہ سوشلسٹ نظام آج کے سرمایہ داری کے نظام سے زیادہ جمہوری ہوگا۔ اس میں قطعی طور پر کوئی شک نہیں کہ سرمایہ داری کی جمہوریت زوال پذیر ہے۔ اس لیے کہ اس کے اندر کوئی متبادل نظام موجود

نہیں۔ اگر اس انداز نظر سے دیکھا جائے تو ارجنٹائن کی مثال نہایت چشم کشا ہے۔ اس سے نہ صرف نولبرل اقتصاد کی ناکامی کا پتہ چلتا ہے بلکہ یہ متبادل کی عدم موجودگی کا اظہار بھی کرتا ہے۔

لیکن ایسی مثالیں نظر آتی ہیں کہ اقتصادی انہدام کے بعد سے ارجنٹائن کے کارکنوں نے تنظیمیں تشکیل دیں اور کارگاہوں پر قبضے کر لیے یا اسی طرح کے دیگر اجتماعی عمل۔

اس وقت اس طرح کے افعال نہایت اہم تھے۔ مزدوروں نے اپنی تنظیم سازی کرتے ہوئے یہ جتلا دیا اور وہ جتلاتے آئے ہیں کہ ان میں اپنا مقدر اپنے ہاتھوں میں لینے کی اہلیت پوری طرح موجود ہے۔ لیکن اگر اس طرح کے اقدامات مقامی سطح پر رہتے ہیں تو دیرپا نہیں ہوتے۔ ان اقدامات کی مثال دینی چاہیے اور ان سے پتہ چلتا ہے کہ ایک مختلف مستقبل ممکن ہے۔ لیکن جب تک اس طرح کا کام قومی سطح پر نہیں ہوتا اور اس میں تنظیم کی کمی رہتی ہے یہ کارگر نہیں ہو پائے گا۔

بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ ہم ریاستوں اور سرحدوں کے خطوط پر نہیں سوچنا چاہتے۔ لیکن قومی ریاست ابھی تک موجود ہے اور اس میں ممکنات بھی ہیں اور مواقع بھی۔ یہ یوٹوپیائی تصور کہ عالمی سرمایہ داری نظام نے سرحدوں کو تحلیل کر دیا ہے اور اب ہمیں بھی کر دینا چاہیے نہایت لغو ہے۔

عالمی سرمایہ داری کو اپنے منصوبوں پر عمل درآمد کے لیے قومی ریاست کی ضرورت ہے۔ سرمایہ داری کو ریاست کی ضرورت ہے اور اس کے متبادل کو بھی ریاست کی ضرورت ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ ریاست کے تصور کو ختم کرنے کی بجائے اس پر قبضہ کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ میری نسل کے لوگوں میں یہ عام فہم بات موجود تھی لیکن آج چونکا دینے والی لگتی ہے۔ یہ کام اب بھی کرنا پڑے گا لیکن طریقہ قدرے مختلف ہوگا۔ اس طرح کے نعرے کہ ہم ریاستی قوت کے بغیر دنیا بدل سکتے ہیں اپنے بھول پن میں بہت متاثر کرتے ہیں لیکن اس میں سے نکلنے والے طریقے خود شکستگی پر منتج ہوں گے۔

آپ بہت عرصے سے سرمایہ داری پر ہونے والی کانفرنسوں میں تقریریں کرتے چلے آئے ہیں۔ یہ کون سی شے ہے جو اس نظام کو چلتا رکھتی ہے۔ ارجنٹائن کے بحران کو

دیکھیں۔ اسے مزید قرضے مل گئے، یہاں مزید رقم پہنچی، انہوں نے زیادہ نوٹ چھاپ لیے، معاملات میں بہتری آئی اور جاری ہے۔

متبادل سامنے آنے تک معاملہ اسی طرح جاری رہے گا۔ تاریخ میں صرف ایک بار ہوا کہ سرمایہ داری کارکنوں کو جمہوری حقوق اور ٹریڈ یونین بنانے کی آزادی جیسی مراعات دینے پر مجبور ہوگئی تھی۔ اور یہ صرف اس وقت ہوا جب سرمایہ داری کے سامنے افق پر ایک دشمن موجود تھا۔ یہ دشمن مذہبی دشمن نہیں تھا بلکہ اس نے ایک ایسا سماجی انداز نظر دینے کا وعدہ کیا تھا جو سرمایہ داری کے تحت میسر آنے والے تمام ممکنات سے ارفع و برتر تھا۔ یہ وعدہ کمیونسٹ مینی فیسٹو میں موجود ہے۔ وہ تجربہ ناکام رہا لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اسے لازم طور پر ناکام ہی رہنا ہے۔ میرا جواب ناں میں ہے۔ اگر روسی انقلاب کے رہنماؤں اور ان کی دوسری نسل نے جان لیا ہوتا کہ ہر چیز کو ریاستی ملکیت میں لینا غلط ہے تو حالات قطعی مختلف رخ اختیار کر سکتے تھے۔ انہیں چاہیے تھا کہ لوگوں کو اشیائے صرف بنانے سے نہ روکتے اور انہیں اپنے ریستوران اور ایسی ہی دیگر چیزیں کھولنے دیتے۔ کارکنوں کو صنعتی انتظام میں کردار ادا کرنے دیتے اور یوں ایک جمہوری سیاسی ڈھانچہ وجود میں آتا اور یہ نظام پھیل چکا ہوتا۔ اسے یوں شکست نہ ہوتی جیسے ہوئی ہے۔ ہم سوویت ماڈل کے حامیوں سے ہمیشہ کہا کرتے تھے، ''ایسا کیوں ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام تو کثیر جماعتی جمہوریت کے پہلو بہ پہلو موجود رہ سکتا ہے تو پھر آپ کے نظام میں کثیر جماعتی جمہوریت کو کس رکاوٹ کا سامنا ہے؟'' ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ فقط یہ اور غلط دعویٰ کرتے کہ مغربی جمہوریت دھوکہ ہے لیکن تمام تر کمزوریوں کے باوجود مغرب اور ریاست ہائے متحدہ میں جمہوریت کی بدولت شہریوں کے ارادوں کا کچھ حصہ بروئے کار آ جاتا ہے۔ سوویت یونین نے سوائے قوت، دباؤ اور سنسر شپ کے کوئی طریقہ وضع نہ کیا۔ سوویت نظام اسی مہلک نقص کے سبب زوال پذیر ہوا۔ اگر کہیں نیا سوشلزم وجود میں آتا ہے تو اسے موجودہ کے مقابلے میں زیادہ جمہوری رہنا ہوگا وگرنہ چلے گا نہیں۔

گور ویڈال (Gore Vidal) نے کہا تھا کہ امریکہ کا نام یونائیٹڈ اسٹیٹس آف ایمنیسیا (United States Amenesia) ہونا چاہیے۔ بہت کم امریکیوں کو علم ہوگا کہ انقلاب کے بعد یورپی ممالک، ریاست ہائے متحدہ اور جاپان نے سوویت یونین پر حملہ کر دیا تھا جس نے اس امکان کو ختم کر دیا کہ وہاں نسبتاً زیادہ جمہوری نظام

وجود میں آ جاتا۔ یوں شدت پسند مزید پکے ہوئے اور کہنے لگے، ''دیکھو! ہم گھیرے میں ہیں اور دشمن ہم پر حملہ آور ہونے لگا ہے۔''

کوئی پندرہ سولہ غیر ملکی افواج نے انقلاب کچلنے کے لیے سوویت یونین پر حملہ کر دیا تھا۔ ہمیشہ یہی ہوا کرتا ہے۔ فرانسیسی انقلاب کو شکست دینے کے لیے یورپ کی ساری بادشاہتیں متحد ہو گئی تھیں۔ انہوں نے انقلابی فرانس پر جنگ مسلط کر دی تھی۔ انقلابی روس کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ انقلاب کے خلاف ان کوششوں کے نتیجے میں روس میں خانہ جنگی چھڑی اور سوویت کارکن طبقے کا چنیدہ حصہ مارا گیا۔ انقلاب لانے میں شریک سیاسی کارکنوں کی ایک بڑی تعداد جنگ میں مر گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ افرادی قوت کے اعتبار سے انقلاب نہتا ہو گیا۔ یوں بیوروکریسی وجود میں آئی، نظام نوکر شاہی کی صورت اختیار کر گیا، سٹالن اقتدار میں آیا اور سٹالن ازم کو سیاسی نظام کی جگہ ملی۔

اگر اس انقلاب کو آزادانہ بڑھنے کا موقع ملتا تو کون جانے یہ کہاں پہنچ گیا ہوتا۔ وہاں منشویک جیسی دوسری پارٹیاں بھی موجود تھیں اور انقلاب دشمن نہیں تھیں۔ ان لوگوں نے وفادار حزب اختلاف کی حیثیت سے کام کیا ہوتا۔ ان جماعتوں اور ان کے پیسوں کو خانہ جنگی کے دوران ختم کر دیا گیا۔ تب لینن نے کہا تھا، ''ہماری بقا خطرے میں ہے۔ کوئی بھی دوسری چیز بے وقعت ہے۔ ہمیں اپنے سب دشمنوں کو کچلنا ہوگا۔'' اگر امریکیوں اور بالخصوص چرچل نے مداخلت کرتے ہوئے خانہ جنگی کے دوران سفید روسیوں کو معاونت فراہم نہ کی ہوتی تو اس طرح نہیں ہو سکتا تھا۔ جنگ عظیم اول نے روس کو پہلے ہی نچوڑ دیا تھا اور اس کے کوئی دو ملین لوگ مارے گئے تھے۔ اور جب اسے خانہ جنگی سے واسطہ پڑا تو ایک عجیب و غریب صورتحال پیدا ہو گئی جس میں اسے سوشلزم یا جمہوری سوشلزم کے قریب قریب کوئی نظام تشکیل دینا تھا۔ یہ بہت بڑا المیہ تھا۔ اگر سوویت یونین میں جمہوری سوشلزم کا ظہور ہو جاتا تو اس نے چین، کیوبا اور ویت نام کو بھی متاثر کیا ہوتا۔ امریکہ اور مغرب نے سوشلزم کے خلاف ان بنیادوں پر نظریاتی حملہ کیا کہ یہ جمہوری نہیں۔ اور اس کا کوئی جواب نہیں ہو سکتا تھا۔ جب اٹلی کی پارلیمنٹ میں انتونیو گرامچی کیمونسٹ ڈپٹی تھا تو اس کا ایک واقعہ بہت مشہور ہوا۔ مسولینی نے ٹریڈ یونین پر پابندی لگا دی اور گرامچی نے اس پر احتجاج کیا تو مسولینی کہنے لگا، ''جب یہی چیز تمہارے محبوب سوویت یونین میں ہو رہی ہے تو تمہیں کیا شکایت ہے۔ گرامچی نے جواب دینا چاہا لیکن کیا کہا جا سکتا تھا۔

MashalBooks.com

اس امر کے شواہد موجود ہیں کہ اقوام متحدہ میں خارجہ تعلقات کی کونسل اور اقتدار کے دیگر مراکز میں موجود طبقہ بالا کو بش انتظامیہ کے انتہا پسندانہ اقدامات پر تشویش ہے۔ کچھ تعجب نہیں کہ نومبر 2004ء میں امریکی حکومت بدل جائے۔ لیکن خیال رہے کہ امپائر میں اپنے کپڑے بدلنے اور تخت پر نئے شہنشاہ کو بٹھانے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ امریکی حکمراں طبقے میں بھی ایک قابل ذکر قوت انتظامیہ کے ان فیصلوں کے خلاف ہے۔ رومن سلطنت کے دنوں میں جب سینٹ بھانپ لیتی تھی کہ شہنشاہ ناقابل استعمال ہو گیا ہے تو وہ جاتی اور اسے قتل کر دیتی۔ اگرچہ امریکہ میں ایسا نہیں ہو گا یا کم از کم سینٹ ایسا نہیں کرے گی لیکن کم از کم وہ اسے اقتدار سے نکال دے گی۔

اگر وہ شکست کھا جاتا ہے تو اس کا کیا مطلب ہو گا۔ اول تو یہ کہ کم از کم مجھے کوئی شک نہیں کہ پوری دنیا بش کی شکست پر خوشیاں منائے گی۔ اسے امن تحریک کی فتح کہا جائے گا جو قرار دیتی ہے کہ یہ وہ شخص ہے جس نے جنگ چھیڑی اور اب اس کے ووٹروں نے اسے سزا دی ہے۔ دنیا بھر میں ہجوم خوشیاں منائیں گے اور اسے بش کی مخصوص سیاست کی شکست سمجھیں گے۔

میں نے جنگ کی طرف لے جاتے حالات میں بات کی تھی کہ اگر عراق کے خلاف جنگ غلط ہے کیونکہ اسے امریکہ نے یکطرفہ طور پر مسلط کیا ہے تو کیا اقوام متحدہ کے جھنڈے تلے جنگ جائز قرار پائے گی؟ مجھے تو اس میں کوئی منطق نظر نہیں آتی۔ ڈیموکریٹک کا صدر بھی بش جیسا سامراجی حاکم بن جائے گا۔ یورپیوں کو لوٹ میں سے حصہ دو، تھوڑا سا تیل دو، عراق میں ٹھیکے دو اور انہیں ساتھ ملا لو۔ خود بش نے یہی طرز کار اپنایا ہے۔ اس نے جنگ مخالف کینیڈینوں کو بتایا کہ جنگ کی مخالفت نہ کرو اور اپنی فوج بھیجو۔ پریشانی کی بات نہیں۔ ہم تمہیں بھی کچھ ٹھیکے دیں گے۔ اسی نے ڈونلڈ رمزفیلڈ کو بھیجا کہ وہ میونخ میں جنگ کوریا کو یاد کرتے ہوئے کچھ آنسو بہا آئے۔

بش نے یہ عمل شروع کر دیا ہے لیکن چونکہ لوگوں کو اس پر کچھ زیادہ اعتماد نہیں۔ چنانچہ اگر وہ اوپر آتا ہے تو اسے لانے والے ڈیموکریٹ ہوں گے۔ اگر وہ جیت نہیں پاتے تو بھی میرے خیال میں امریکی تاریخ سے نوکانی (Neocon) عہد کا خاتمہ ہو چکا۔ حتیٰ کہ نئی بش

انتظامیہ بھی زیادہ مہربان سلطنت نظر آنے کی کوشش کرے گی۔ ڈیمو کریٹ تو یقیناً یہی کچھ کریں گے اور اس میں تو کوئی شک نہیں کہ وہ بھی سلطنت کے عزائم سے دستبردار نہیں ہوں گے۔

آپ نے بات کی تھی کہ امریکی قوت کو متوازن کرنے کے لیے مشرق بعید میں مختلف اقوام چین، جاپان اور کوریا کے گرد اکٹھی ہونے لگیں گی۔ یہ تمام حکومتیں ریاستی سرمایہ دار ہیں اور یقیناً متبادل موجود نہیں۔ یوں ایک بار پھر اسی طرح کا معاملہ ہوگا جیسے پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں جرمن ریاستی سرمایہ داری برطانوی ریاستی سرمایہ داری کے سامنے آ گئی تھی؟

میں نے ایسی کوئی بات نہیں کہی کہ مشرق بعید کا یہ بلاک ہمارے درمیان موضوع گفتگو بننے والے کسی متبادل نظام کا پیش کار ہے۔ تاہم اگر اس بلاک کا ظہور ہو جاتا ہے تو امریکی سلطنت کو نہایت اہم حریف ضرور میسر آ جائے گا۔ اگر سامراجی قوتوں کے باہمی تضادات متشکل ہوتے ہیں تو میرا خیال ہے کہ تصادم یورپ اور امریکہ کے درمیان نہیں بلکہ مشرق بعید کے بلاک اور امریکہ کے درمیان ہوگا۔ اور یوں یورپ کو اتنی ہمت میسر آئے گی کہ خود ایک بلاک بن سکے۔ یورپ اپنے طور پر تو یہ کام یقیناً نہیں کرے گا۔

انسانی تاریخ میں یہ زمانہ اس اعتبار سے منفرد ہے کہ صرف ایک سامراجی قوت موجود ہے۔ سامراجی اقتدار کے سابقہ مراحل میں یہ صورتحال کبھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ مشرق بعید کا بلاک بننے کی صورت میں ہمیں ایک بار وہی صورت حال مل سکے گی۔ انہی حریف قوتوں کے منظم ہو جانے کے ڈر سے ریاست ہائے متحدہ اوکی ناوا میں اپنے اڈے برقرار رکھے ہوئے ہے اور کوریا سے بھی اپنی فوج نہیں نکالتا۔ اگر کوریا متحد ہو جاتا ہے تو وہاں امریکی دستوں کا کوئی جواز نہیں۔ اوکی ناوا میں امریکی اڈے کیوں موجود ہیں؟ محض اس لیے کہ جاپانی اپنی خارجہ پالیسی آزادانہ وضع نہ کرنے لگیں۔ یہی وجہ ہے کہ جاپانیوں کو اپنا ایک دستہ عراق میں بھجوانا پڑا۔ آپ کے خیال میں ایسا آ سکتا ہے۔ جاپانی سپاہیوں کا ایک دستہ عراق میں چھوٹے موٹے فرائض پر مامور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشرق بعید بلاک کا ظہور تعطل کا شکار ہے۔ جو یقیناً چین، جاپان اور کوریا کی سرمایہ داری کے مفاد میں ہوگا۔ ظاہر ہے کہ ان ملکوں کے لیے اپنی ایک یونین کا ہونا مفید ہوگا لیکن امریکہ تلا ہوا ہے کہ اسے وجود میں نہیں آنا چاہیے۔ ابھی تک تو

MashalBooks.com

امریکہ یونین کو روکنے کے لیے دباؤ سے کام لے رہا ہے۔کیا وہ اس بلاک کو روکنے کے لیے طاقت استعمال کرے گا۔جس کا ایک طریقہ یہ ہوسکا ہے کہ چین کو ولکنائز کر دے۔مثلاً فرض کریں کہ تائیوان یا تبت میں بدامنی پیدا کرنے لگے۔امریکیوں کو یہ متبادلات تو میسر ہیں لیکن اب تبت اور بیجنگ حکومت کے درمیان معاملات طے ہونے کو ہیں۔لگتا ہے کہ دلائی لامہ اس موقف پر آ گیا ہے کہ جب تک تبت خودمختار ہے اسے چین سے نکلنے کی ضرورتہے ۔ وہ بھی یہ چاہتا ہے کہ چینی خارجہ پالیسی اور دفاع چلاتے رہیں اور دیگر بڑے معاملات بھی ان کے ہاتھ میں رہیں۔ اگر یہ اندازہ درست ہے تو ریاست ہائے متحدہ کے پاس صرف تائیوان باقی رہ جاتا ہے۔اور جو کچھ وہاں ہوگا فیصلہ کن ہوگا۔ہمیں خطے کا اندازہ اس انداز میں بھی لینا چاہیے کہ اسے اس یونین کے عدسے سے بھی دیکھنا چاہیے جسے امریکہ روکنا چاہتا ہے۔امریکیوں کو پتہ ہے کہ اس طرح کی یونین سلطنت کی حریف ثابت ہوسکتی ہے۔

آپ نے مسلم مغربی چین کے متعلق کیا کہا؟

مغربی چین کا معاملہ چین کے لیے بھی تشویش ناک ہے۔ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے دیگر جگہوں پر بھی امریکہ کے لیےتشویش پیدا کر رکھی ہے۔انہی لوگوں نے افغانستان میں جہاد کیا تھا اور یہ خاصے جنگ آزمودہ ہیں۔مغربی چین کے مسلمان سوویت یونین کے خلاف جہاد کے لیے افغانستان پہنچے اور اب واپس اپنے وطن میں پہنچ کر مسائل کھڑے کر رہے ہیں۔کوئی شک نہیں کہ چین نے ان کے ساتھ نہایت پرتشدد اور بدترین طریقے سے نپٹا ہے اور علاقے پر اس کی گرفت مضبوط ہے۔

امریکی کہیں پریشانی کھڑی کر سکتے ہیں تو وہ تائیوان ہے۔ بشرطیکہ خود تائیوانی اس پر آمادہ نظر آئیں۔ بیجنگ حکومت کو چاہیے کہ اگر مجبوری نہ ہو تو تائیوان پر اپنا دعویٰ واپس لے لیں اور تمام چینی علاقہ جات پر مشتمل ایک دولت مشترکہ تشکیل دیں۔ جب ایک بار تائیوان اور چین کو ایک دوسرے کی منڈی میسر آ گئی تو امریکی چین کو پریشان کرنے کی غرض سے تائیوان میں اڈہ نہیں بنا پائیں گے۔اس طرح کی سوداکاری بیجنگ کے مفاد میں ہوگی۔

بھارتیہ جنتا پارٹی (بی جے پی) نے ہندوستان اور ہندو بنیاد پرستی کے احیا میں کیا کردار ادا کیا ہے۔آپ نے 2002ء میں گجرات کے قتل عام کا حوالہ دیا ہے۔برصغیر پاک و

ہند میں فرقہ وارانہ فسادات کی ایک طویل تاریخ موجود ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ جدید عہد کے ہندوستان میں پہلی بار ہندو بنیاد پرستی کے لیے کوئی سنجیدہ کوشش ہوئی ہے۔ نہرو اور گاندھی جیسے پرانے قوم پرست اپنے مزاج میں امتزاجی تھے۔ گاندھی نے ہندو امیجری کو استعمال کیا لیکن وہ ہندوستان کو کئی تہذیبوں کی متحد قوم سمجھتا اور کہتا رہا۔ اس نے تقسیم کے فوراً بعد ہونے والے قتل عام میں مسلمانوں کے دفاع میں اپنی جان دی۔ اب ہندوستانی قومیت پرستی کی جگہ ہندو قوم پرستی لینے لگی ہے اور اس میں بی جے پی کا کردار خاصا اہم ہے۔ سرمایہ داری کا واحد موجود متبادل شکست و ریخت سے دوچار ہوا تو ایک بڑا خلا سامنے آیا اور ایسے لوگوں سے بھر گیا جن کا دعویٰ ہے کہ آج کی دنیا میں ہر شخص کو اپنا دفاع خود کرنا ہے۔ چونکہ یہ مسابقت کی دنیا ہے چنانچہ ہمیں اپنے تشخص کے لیے لڑنا ہوگا۔ ہمارا تشخص ہندو قوم کا تشخص ہے اور دیگر تمام اور بالخصوص مسلم اقلیت کی کوئی حیثیت نہیں۔ یہاں بھی اسی طرح کے حالات ہیں جنہوں نے مسلم دنیا، ریاست ہائے متحدہ، اسرائیل اور دنیا کے باقی حصوں میں بنیاد پرستی کو جنم دیا تھا۔ سماجی تحفظ کے جال جنہیں نہرو کی کانگرس نے نہیں چھیڑا تھا انہیں ہٹا دیا گیا۔ نتیجتاً معاشرے کی نچلی سیڑھیوں پر موجود لوگ بدترین حالت میں چلے گئے۔ اسی مسابقت نے لوگوں کو حوصلہ دیا کہ وہ مسلمانوں کو قربانی کا بکرا بنائیں۔ غریب ہندو انہی مسلمانوں کو نفرت سے دیکھتے ہیں جو کم و بیش انہیں جتنے غریب ہیں۔ لیکن ان غریب ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف منظم کیا جاتا ہے، ان کا صفایا ہوتا ہے، گھر لٹ جاتے ہیں، بیویوں سے زیادتی ہوتی ہے اور بچے تشدد کا نشانہ بنتے ہیں۔ یہ سب بڑے منظم پیمانے پر ہوتا ہے اور اس کا نتیجہ بالآخر گجرات جیسے واقعات میں سامنے آتا ہے۔

صدمہ کی بات یہ ہے کہ گجرات حکومت جس نے اس سارے قتل عام کی پشت پناہی کی، ایک بار پھر منتخب ہو جاتی ہے۔ کانگرس کسی بھی طرح کا متبادل فراہم نہ کر سکی۔ انہوں نے گجرات کے وزیراعظم نریندر مودی کے خلاف وہی امیدوار کھڑا کیا جو بی جے پی سے بھاگ کر کانگرس میں آیا تھا۔ کیسا مذاق ہے۔ پرانے وقتوں میں دلت (اچھوت) اور ان کا رہنما امبید کر کہا کرتے تھے، ''ہمیں ہندو نہ کہو۔ ہندو تو برہمن ہیں، ہم نہیں۔'' لیکن اس پر گاندھی سمیت کوئی تیار نہ ہوتا۔ کیونکہ اگر ان نچلی ذات والوں کو نکال دیا جاتا تو ہندو آبادی کا تناسب بگڑتا تھا۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ بنیادی طور پر بالائی اور متوسط طبقے کی نمائندہ بی جے پی کو نچلی ذات کے ہندوؤں کی حمایت بھی ملنے لگی ہے۔ یہ بات پریشان کن ضرور ہے لیکن ہماری

آج کی دنیا کی عکاس ہے۔

2002ء میں گجرات کے فسادات میں نریندر مودی بھی ملوث تھا؟

اس کی پولیس لوگوں کو قتل ہوتے دیکھتی رہی۔ مسلمانوں کے گھر راکھ ہو گئے اور اس نے کچھ نہ کیا۔ ان واقعات کا ہولناک ترین پہلو یہ تھا کہ ریاست آبادی کے ایک حصے کے ہاتھوں دوسرے حصے کو قتل ہونے سے نہ روک سکی۔ مودی نے پولیس کا دفاع کیا اور ان الزامات کو ماننے سے منکر رہا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس طرح کا کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ دوبارہ منتخب ہونے کے بعد تو وہ مکمل قابو سے باہر ہو گیا۔

اب میں آپ کے بارے میں کچھ پوچھوں گا۔ آپ نے اپنی امید کو کس طرح زندہ رکھا اور اس شعلے کو بجھنے نہ دیا۔

میں نے اس کے متعلق کبھی نہیں سوچا۔ ترجیحاً مجھے اپنا خیال سب سے آخر میں آتا ہے مجھے اقتدار نے نہیں ورغلایا خواہ وہ دنیاوی ہو یا درس گاہی۔ مجھے اس میں کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ مجھے پروفیسر بننے کی خواہش نہیں۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ اچھے پروفیسر موجود نہیں۔ لیکن بس اس طرز زندگی میں شامل نہیں ہونا چاہا۔ میں نے ہمیشہ بطور آزاد مصنف گزارا کیا ہے اور اب تک کر رہا ہوں۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ کبھی دوبارہ نان فکشن لکھوں گا۔ لیکن 11 ستمبر کے بعد میں یہ کتابیں لکھنے پر مجبور ہو گیا۔ جب جرمنی، برازیل یا سپین میں لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ آپ نے "Islam Quintet" مکمل نہیں کی تو میں کہتا ہوں، "اس کا الزام بش کو دو۔"

اسی لیے مجھے بے تحاشا سفر کرنے پڑے۔ ہر ہفتے ہر براعظم سے تیس چالیس دعوت نامے ملتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ میں ان سب کو قبول نہیں کر سکتا اور نہ ہی کسی اور کے لیے یہ ممکن ہے۔ سب سے زیادہ دعوت نامے ریاست ہائے متحدہ سے آتے ہیں۔ چنانچہ میں نے وہاں کے بہت سفر کیے ہیں۔ میری ہر ممکن کوشش ہوتی ہے کہ وہاں ضرور پہنچوں۔ اس لیے کہ یہ ملک اور اس کے لوگوں کی رائے مستقبل کے حوالے سے نہایت اہم ہے۔ یہ لوگ دباؤ ڈال کر امریکی حکمران طبقے کا رویہ اور شاید دنیا کو بدل سکتے ہیں۔

اس طرح کی چیزیں کرنے والے لوگ دنیا میں بہت کم ہیں۔ اور میں بڑی شدت سے

چاہتا ہوں کہ نئی نسل کے لوگ آ کر اس کام کو سنبھالیں۔ کیونکہ بعض اوقات ان کاموں کا بوجھ قدرے خوف زدہ کر دیتا ہے۔ اگر آپ دعوت نامے مسترد کرتے ہیں تو لوگ کہتے ہیں کہ ''اوہ! تم تو بہت اونچا اڑ رہے ہو۔ لیکن میں ساٹھ برس کا ہو چکا ہوں اور اس عمر میں بھی جس قدر زیادہ ہو سکے کرتا ہوں۔ اب میں نے ویسٹ کوسٹ، ایسٹ کوسٹ، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے ہوائی سفروں کے دوران خاصا کام کرنے کا ہنر سیکھ لیا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ فکشن کے وہ سارے منصوبے تشنہ تکمیل ہیں جو سالوں پہلے ایڈورڈ سعید نے مجھ پر لاد دیئے تھے۔ جب سپین میں مسلم تہذیب کے زوال کا حال "Shadows of a Pomegranate Tree" چھپا تو ایڈورڈ سعید نے کتاب پڑھی اور پسند کی۔ اس نے کہا، ''اب تم رک نہیں سکتے۔ تمہیں اس سلسلے کو آگے بڑھانا اور پوری کہانی سنانا ہوگی کیونکہ یہ تو فقط آغاز ہے۔'' چنانچہ اس کے بعد میں نے "The Book of Saladin" لکھی۔ یہ کتاب صلیبی معرکوں پر ہے جس میں عربوں اور یہودیوں نے یروشلم پر دوبارہ قبضہ کیا اور صلیبیوں کو نکال دیا۔ یہ میرا واحد ناول ہے جو ایک اسرائیلی پبلشر نے عبرانی میں ترجمہ کروایا۔ اس لیے کہ اس میں مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان تعلق کا بیان ہے اور مجھے یہ موضوع بہت مرغوب ہے۔ چار ناولوں کے اس سلسلے میں تیسرا "The Stone Woman" سلطنت عثمانیہ اور اس کے زوال پر ہے۔ ابھی مجھے دو مزید ناول مکمل کرنا ہیں۔ ایک ناول "Sultan in Palermo" ہے۔ اس کا تناظر بیسویں صدی کا سسلی ہے۔ صلیبی معرکوں اور اسلامی سپین تو خاصے معروف ہوئے لیکن سسلی 'یورپ' میں مسلم حکومت اور اس کی شکست سے کچھ بہت لوگ باخبر نہیں۔ کبھی پالرمو کو سو مساجد کا شہر کہا جاتا تھا اور اب کسی ایک کا سراغ نہیں ملتا۔ میں مسلم شکست کے فوراً بعد کے زمانے پر لکھوں گا۔ آخری ناول بیسویں اور اکیسویں صدی کے تناظر میں ہوگا اور حالیہ زمانے تک آئے گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ یہ عربوں کے حوالے سے نہایت شگفتہ ناول ہوگا۔

MashalBooks.com

7

فلسطین اور اسرائیل

یہ بتائیے کہ مسلمانوں کے لیے فلسطین اتنا اہم کیوں ہے؟

فلسطین عرب دنیا کا بہت اہم حصہ ہے اور اسی لیے اس کا مسئلہ غم وغصہ اور اضطراب کو جنم دیتا ہے۔ فلسطینیوں کو دنیا کے قدیم ترین باشندے سمجھا جاتا ہے۔ جس بھونڈے اور ظالمانہ طریقہ سے اسرائیل کی ریاست وضع کی گئی اور جس طرح فلسطینیوں کو دیس نکالا دیا گیا۔ ان کے گاؤں لوٹے گئے، نسل کشی کی گئی اور نجانے کتنی عورتوں کی عزت لوٹی گئی، اس نے عرب دنیا پر اپنے نشان چھوڑے۔ اس کا معاشرتی اور سیاسی دھچکا اسی طرح کا تھا جیسے اس پر گیارھویں صدی میں صلیبی جنگ کرنے والے وارد ہوئے تھے۔ دونوں بار دھچکے کی نوعیت ایک سی تھی۔ ایک جہان میں مداخلت کی گئی اور چھین لیا گیا اور فلسطینیوں کی اجازت کے بغیر اور ان کی شمولیت کے بغیر ایک بڑی سامراجی قوت یعنی برطانیہ عظمیٰ نے ایک نیا ملک بنا دیا۔ زیادہ تر عرب اسی طرح سوچتے ہیں۔ اس دھچکے میں یہ صدمہ بھی شامل ہو جاتا ہے کہ عرب فوجیں یہ علاقہ واپس لینے میں ناکام رہیں۔ اور یہ صدمہ بھی کہ ان افواج کا کنٹرول بدعنوان افسروں اور بادشاہوں کے پاس تھا جنہوں نے 1948ء کی جنگ سبوتاژ کر دی۔ عرب شکست کی وجہ محض اسرائیلی برتری یا ان کا جنون نہیں تھا جو کہ ایک حقیقت ہے بلکہ عرب جنگ کا دکھاوا کرنا چاہتا تھا۔ بیسویں صدی کے بڑے عرب مصنفین میں سے ایک عبدالرحمان منیف نے اپنی کتاب ''Story of a City: A Childhood in Oman'' میں اس صدمے کی گہرائی اور گیرائی کو بیان کیا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ سکول میں جب استاد طالب علموں سے دس عرب شہروں کے نام لینے کو کہتا تو ان میں سے چھ فلسطین کے ہوتے۔ یہ شہر ہم بھول نہیں

MashalBooks.com

پائے۔ روز خبروں میں ہمیں یاد دلائے جاتے ہیں۔ یہ ناکامی عربوں کے اندر بہت گہری اتر گئی اور اسی نے عرب قومیت پرستی کو جنم دیا۔ اسرائیل کے قیام نے عرب دنیا میں انقلابی عرب نیشنل ازم کی نئی لہر پیدا کر دی جس کا بڑا علمبردار جمال عبدالناصر صلاح الدین کے بعد عربوں کا مقبول ترین رہنما بنا۔

تب سے فلسطینیوں کو بڑے منظم طور پر کچلا جا رہا ہے۔ 1967ء کی جنگ کے بعد سے اسرائیل کی سرحدیں پھیلتی جا رہی ہیں۔ صیہونی قیادت نے بطور سیاسی قیادت فلسطینیوں کو ختم کرنے اور ان کے جذبے کو کچلنے کے لیے ہر ممکن کام کیا تاکہ وہ بھول جائیں کہ اصل میں وہ کیا تھے۔ کبھی امریکہ میں لائے گئے غلاموں کی طرح اسرائیل کو امید تھی کہ یہ لوگ بھی جلد ہی اپنی شناخت بھول جائیں گے اور اپنی نئی حیثیت کو قبول کر لیں گے۔ لیکن اس طرح کا خیال غلط ثابت ہوا اور وہ صورتحال پیدا ہوئی جس سے ہم آج دوچار ہیں۔ اور جس میں کچھ حاصل کرنے کے لیے رعایت دینے کی ہر کوشش ناکام رہی۔

آج ہم امریکہ میں بیٹھے ایک ایسے وقت میں اسرائیل اور فلسطین کے مسئلے پر بات کر رہے ہیں جب جارج بش نے اسرائیل کو اجازت دے دی ہے کہ وہ فلسطین کا سارا علاقہ اپنے پاس رکھ سکتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ 1967ء کی سرحدوں کی بحالی ایک یوٹوپیائی بات ہے اور یہ کہ آبادکاروں کی بستیاں قائم رہنی چاہئیں۔ اور غزہ کو وارسا کے گھیٹو (Gheto) کی طرح ایک بڑا گھیٹو بنا کر اسرائیل کی مستقل نگرانی میں دے دینا چاہیے۔ جب یہ صورتحال ہو تو کوئی کیا کہہ سکتا ہے۔ چنانچہ کچھ تعجب نہیں کہ عربوں کے حکمران طبقے کو چھوڑ کر عربوں کی ایک بڑی تعداد کے ذہن میں فلسطین کو ایک مرکزی مسئلے کی حیثیت حاصل ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے کہ تمام تر انسانی حقوق اور بنیادی انسانی شرافت کی آئے دن کی خلاف ورزی کے باوجود مغرب کا روشن خیال ضمیر فلسطینیوں کی طرف سے آنکھیں بند کیے ہوئے ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خاص طور پر ریاست ہائے متحدہ فلسطینیوں میں سے ہر کسی کو دہشت گرد سمجھتا ہے۔ آج یہ اصطلاح ہر اس شخص کے لیے استعمال کی جاتی ہے جو سامراجی عزائم میں سے کسی ایک کے خلاف آواز اٹھاتا ہے اور امریکی ذرائع ابلاغ فلسطینیوں کے متعلق یہ امیج بنا چکے۔ امریکہ میں موجود روشن خیال اس حوالے سے ناقابل یقین حد تک کمزور ہیں۔ دنیا کی غالب قوت امریکہ کے اندر فلسطین کے متعلق عامۃ الناس کی رائے وہی ہے جو امریکی حکومت کہتی ہے کہ یہ کمتر انسان اور دہشت گرد ہیں۔

فلسطین کے خلاف اور عرب نسل پرستی کی شدت چونکا دینے والی ہے۔ اگر اہل کوسووو کے ساتھ میلوسووچ کے سلوک کا تقابل فلسطینیوں کے ساتھ ہونے والے سلوک سے کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ فلسطینیوں کے خلاف جرائم کی نوعیت بالکل مختلف طرح کی ہے۔ ہر روز اسرائیلی افواج نوعمر اور بالخصوص نوجوان لڑکوں کو قتل کرتی ہے۔ پچھلے تین سالوں میں شاید ہی کوئی ہفتہ گزرا ہو کہ فلسطین میں کوئی نوجوان قتل نہ ہوا ہو۔ پیمانے کے اعتبار سے نہ بھی سہی تو نیت کے اعتبار سے یہ نسل کشی کی جنگ ہے جس میں فلسطینیوں کو قتل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اپنے اس عمل کا جواز پیش کرتے ہوئے اسرائیلی کہتے ہیں کہ ہم آنے والے کل کے دہشت گردوں کو ہلاک کر رہے ہیں۔

اگر امریکہ فلسطینیوں کی طرف سے اندھا ہے تو یورپی بھی جزواً اندھے ہیں۔ انہیں خبر ہے کہ فلسطین میں کیا ہو رہا ہے اور وہ اس پر خوش بھی نہیں لیکن اسرائیل نے انہیں باندھ رکھا ہے۔ جنگ عظیم دوم کی یہود کشی کے سبب جرمن اسرائیل کے خلاف آواز نہیں اٹھانا چاہتے۔ لیکن جس طرح اہل بیلجیئم کی موجودہ نسل کانگو میں مظالم اور نسل کشی کی ذمہ دار نہیں اسی طرح جرمنوں کی موجودہ نسل بھی یہود کشی کی مجرم نہیں۔ ماضی کی کسی نسل کے جرائم کو موجودہ نسل کے کھاتے میں نہیں ڈالا جا سکتا۔ لیکن یہودی جرمن حکومتوں سے یہی کچھ کہتے ہیں۔ بہت کم جرمن سیاست داں اس پر لب کشائی کی جرأت کرتے ہیں۔ جرمنی کے بغیر باقی یورپ آواز اٹھاتے تذبذب کا شکار ہو جاتا ہے۔ انہیں وقوعوں کا علم ہے لیکن وہ آواز اٹھاتے گھبراتے ہیں۔

میں نے یہ پہلے بھی کہا ہے اور پھر دہراتا ہوں کہ جنگ عظیم دوم میں یہود کشی کے بالواسطہ مجرم فلسطینیوں کو بنایا جا رہا ہے۔ اگر یہودی براہِ راست نسل کشی کا شکار ہوئے تھے تو فلسطینی بالواسطہ شکار ہو رہے ہیں۔ جو کچھ بھی ہوا تھا اس کی ذمہ داری فلسطینیوں پر نہیں۔ اس امر کی ذمہ داری عربوں پر نہیں مسیحی تہذیب کے کندھوں پر ہے کہ چھ ملین یہودی صاف ہو گئے۔ اسی طرح اس کی ذمہ داری مسلمانوں اور فلسطینیوں پر بھی نہیں۔ میں فقط فاشسٹ ریاستوں پر الزام نہیں دھرتا جنہوں نے یہ ظلم کیے بلکہ یہ ذمہ داری روز ویلٹ اور چرچل پر بھی عائد ہوتی ہے جنہوں نے ان عقوبتی کیمپوں کو جانے والی ریلوے لائنوں پر بمباری سے انکار کر دیا تھا۔ انہیں عقوبتی کیمپوں کی جگہ کا علم تھا اور وہ جانتے تھے کہ وہاں کیا ہو رہا ہے لیکن انہوں نے ان کو جانے والی ریلوے لائنوں اور عقوبتی کیمپوں پر طیارے بھیجنے سے انکار کر دیا۔

MashalBooks.com

کیوں؟ اس لیے کہ ان کی ترجیح اور تھی۔ یہودیوں کی جانیں بچانے سے زیادہ انہیں جنگ جیتنے میں دلچسپی تھی۔ اس اسطورے میں کوئی سچائی نہیں کہ دوسری جنگ عظیم یہودیوں کو بچانے کے لیے لڑی گئی تھی۔

ہمیں آج اسی طرح کی صورتحال کا سامنا ہے جس کے نتیجے میں صورتحال مزید خراب ہو گی اور فلسطین میں تشدد کا عمل جاری رہے گا۔ اسرائیل نے دیہات کو نشانہ بنانے، آبادی کو اجتماعی سزا دینے اور رہنماؤں کو قتل کرنے کا وطیرہ اپنا رکھا ہے اور یہ ریاستی دہشت گردی کی ننگی ترین شکل ہے۔

اسرائیل میں بھی کچھ لوگ اس عمل کے خلاف ہیں اور انہیں اپنی حکومت کی کارروائیوں پر ندامت ہے۔ ان کی تنقید ریاست ہائے متحدہ میں اٹھنے والی کسی بھی آواز سے زیادہ کاٹ دار ہے۔ ستمبر 2003ء میں دو درجن سے زیادہ اسرائیلی پائلٹوں نے ایک اعلان عام پر دستخط کرتے ہوئے قرار دیا کہ وہ فلسطینی دیہات اور قصبوں پر بمباری نہیں کریں گے۔ انہوں نے اپنے بیان میں کہا کہ ہمیں اسرائیلی ہوائی فوج میں بھرتی کیا گیا تھا نہ کہ کسی مافیا میں۔ اور نہ ہی ہمارا مقصد انتقامی کارروائیوں میں قتل عام کرنا ہے۔ یوں اسرائیل میں خاصی بحث چھڑی اور یہ کوئی چھوٹا معاملہ نہیں ہے۔ ابھی تک کسی امریکی پائلٹ نے عراق یا ویت نام پر بمباری سے انکار نہیں کیا۔ کچھ سپاہی جنگ سے دستبردار ہوئے لیکن کسی امریکی بمبار پائلٹ کی طرف سے ایسا کوئی انکار سامنے نہیں آیا۔ انکار کرنے والے ان پائلٹوں کا یہ عمل ان کے بلند سیاسی شعور کا غماز ہے۔ اسرائیلی پریس اور سیاست دانوں نے ان کے اس عمل کی شدید مذمت کی۔

پائلٹوں کے عمل اور ان پر ہونے والی تنقید نے بعض روشن خیال اسرائیلی صحافیوں کو بھی بولنے پر مجبور کر دیا لیکن انہوں نے بھی پائلٹوں پر تنقید کی اور اسرائیلی حکومت کے دفاع میں لکھا۔ ان میں سے ایک یہودا نریل (Yehuda Nuriel) نے اپنا ایک مضمون ''Schicklgruber'' کے نام سے لکھا جو ہٹلر کا اصل نام تھا۔ غالباً انجانے میں یہ مضمون اسی طرح چھپ گیا۔ اس صحافی نے ہٹلر کی سوانح عمری ''Mein Kemph'' اور ہٹلر کی تقریروں سے اخذ کردہ فقروں کی مدد سے پائلٹوں پر تنقید کی۔ مضمون چھپا اور ایڈیٹروں کو اس پر کوئی اعتراض بھی نہ ہوا۔ حتیٰ کہ کسی کی تاریخ کی یادداشت نے اشارہ دیا اور وہ پکار اٹھا کہ یہ شخص تو یہودی نہیں۔ ظاہر ہے کہ نریل کو فوراً اخبار سے نکال دیا گیا۔ اصل بات یہ ہے کہ اس شخص نے جرأت کا مظاہرہ کیا جو قابل تحسین ہے۔ میں تو امریکہ اور یورپ کے بڑے صحافیوں

MashalBooks.com

سے اکثر کہتا ہوں کہ ہنریل تم لوگوں سے زیادہ جرأت مند ہے۔

میرا خیال ہے کہ 1948ء کے بعد یہ فلسطینیوں کے لیے بدترین دورانیہ ہے۔ اب اسرائیلی عرفات کو قتل کرنے کی بات کرتے ہیں اور نوآباد کار قوتوں کی ذہنیت کے عین مطابق فرض کر لیتے ہیں کہ کسی لیڈر کی گردن اڑا کر مزاحمتی قوت کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ برطانیہ نے اپنی سامراجیت کی پوری تاریخ میں یہی حکمت عملی اختیار کیے رکھی۔اس طرز عمل کے حق میں بعض اوقات ایک عجیب طرح کا طرز عمل اختیار کیا جاتا ہے کہ اگر کلی کو ہی ختم کر دیا جائے تو پھول نہ کھلے گا۔

میرا خیال ہے کہ یہ تصور نباتات کے لیے تو درست ہو سکتا ہے سیاست کے لیے نہیں۔ چیزوں کو ابتدا میں دبا دیں یا پختہ ہونے کا انتظار کریں اور پھر سر اتاریں اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔نئی نسل کے سر ایک بار پھر سامنے آ جاتے ہیں۔اسرائیلیوں نے ابتدا میں دبانے کی بجائے حماس کے رہنما احمد یاسین اور عبد العزیز رانتیسی کو بہت بعد میں قتل کیا۔آج کے بچے اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ اور ان کے اہل خانہ کس حالت میں زندہ ہیں اور انہیں کیسی ذلت کا سامنا ہے۔ وہ یاسین اور رانتیسی کا ماتم کریں گے اور کل ان کے نقش قدم پر چلیں گے۔ عرفات کے قتل پر بھی یہی کچھ ہوگا۔ لوگ اپنی جدوجہد جاری رکھیں گے۔ یہ خیال پاگل پن ہے کہ وہ رک جائیں گے۔ یہ کام کسی قیمت پر نہیں ہوگا۔ دہشت گردی کے خلاف ہونے والی جنگ بجائے خود دہشت گردی بن گئی ہے۔اپنی آزادی کے لیے کوشاں لوگوں کو ریاستی دہشت گردی کا سامنا ہے۔

آپ کی طرف سے فلسطین میں اسرائیلی حکمت عملی کو نسل کشی قرار دینے پر مجھے پریشانی ہوتی ہے۔

میرا مطلب یہ نہیں کہ یہ کام اسی پیمانے پر ہو رہا ہے جیسے وسطی یورپ اور جرمنی میں یہودیوں کے خلاف ہوا تھا۔ یہ ان معنوں میں نسل کشی نہیں۔ یہ روانڈا کے معنوں میں بھی نسل کشی نہیں بلکہ یہ ویت نام کے معنوں میں بھی نسل کشی نہیں جہاں اٹھاون ہزار امریکیوں کے مقابلے میں اڑھائی ملین ویت نامی مرے تھے۔

میرا کہنا ہے کہ یہ بات اچھی طرح واضح ہو جانی چاہیے کہ عزائم نسل کشی کے ہیں۔ جب آپ نوعمر بچوں کو نشانہ بناتے ہیں تو اصل میں آپ اگلی نسل کو قتل کرتے ہیں۔ یہ مقتولوں کی

MashalBooks.com

تعداد کے اعتبار سے نسل کشی نہیں بلکہ سزا دینے اور دھمکانے کے ساتھ ساتھ کل کی نسل کو قتل کرنے کے معنی میں نسل کشی ہے، مجھے اس سے خوف آتا ہے۔

> رویے کی تشکیل کو صرف فلسطینیوں پر مرکوز رکھنے کی بجائے عربوں اور مسلمانوں کو سامنے رکھتے ہوئے نسل پرستی پر بات کریں؟ میں برطانوی ٹی وی شو کے میزبان رابرٹ کلرائے سلک کا ایک پیرا پڑھ کر سناتا ہوں: ''ہم کسی طرح عربوں کے مرہون منت نہیں سوائے تیل کے جسے مغرب نے دریافت کیا، نکالا اور اس کی ادائیگی کی۔ اس میں عربوں کا کتنا ہاتھ ہے اور خود عرب خودکش حملے کرتے ہیں اعضا کی قطع و برید کرتے اور عورتوں کو دبا کر رکھتے ہیں۔ اوقیانوس کے اس طرف مقبول مصنف اور ٹی وی مفکر این کولٹر جیسے لوگ بھی ہیں جن کا کہنا ہے کہ ہم لوگوں یعنی امریکیوں اور یورپیوں کو ''ان ممالک پر حملہ آور ہو کر رہنماؤں کو ہلاک کر دینا اور انہیں عیسائی بنا لینا چاہیے۔'' پھر یہاں ولیم لنڈ جیسے قدامت پسند لوگ بھی ہیں جن کا کہنا ہے، ''اسلام سیدھا صاف جنگ کا مذہب ہے۔'' پھر ولی گراہم کا بیٹا فرینکلن کہتا ہے کہ ''اسلام ہی ساری برائی ہے اور برائی کا مذہب۔''

ہر کہیں موجود چیزوں کو اس طرح سیاہ اور سفید میں دیکھنے والے لوگ موجود ہیں۔ برطانیہ اور امریکہ بھی ان سے خالی نہیں۔ فرانس میں بھی اس طرح کی باتیں کہی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر فرانسیسی مصنف برنارڈ ہنری لیوی جو ایک ممتاز ریاستی دانشور ہے ڈینیئل پرل کے حوالے سے ایک کتاب لکھتا ہے جو پاکستان کے خلاف کراہت آمیز مواد سے بھری پڑی ہے۔ اس لیے کہ وہ اس ملک کو جانتا نہیں، وہاں کی زبان نہیں جانتا اور وہاں کے لوگوں سے واقف نہیں لیکن 500 صفحات کی ایک کتاب لکھ دیتا ہے جو گندگی کا ڈھیر ہے۔ اسی طرح کا کام اٹلی کی صحافی خاتون اُریانا فلاچی نے بھی کیا۔ یہ سب کچھ دانشورانہ اور اخلاقی دیوالیہ پن کی علامت ہے۔ یہ لوگ یہی کچھ کرتے رہیں گے۔

ذرا سوچیں کہ کسی نے یہی باتیں یہودیوں کے بارے میں کی ہیں۔ اگر کولٹر نے یہی تبصرہ یہودیوں یا، حتیٰ کہ امریکی افریقیوں کے بارے میں کیا ہوتا تو اسے لینے کے دینے پڑ جاتے۔ لیکن 11 ستمبر کے بعد عربوں اور مسلمانوں کے متعلق ہر کسی کو ہر بات کہنے کی اجازت ہے۔

عرب حکومتیں اور زیادہ تر مسلمان حکومتیں اپنے اور اپنے تمدن کے خلاف اس سامراجی زبان درازی کے متعلق کچھ نہیں کر سکتے۔ یہ درست ہے کہ عام لوگ قوت سے نہیں ڈرتے اور نہ ہی انہیں ڈرایا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ دونوں حربے عرب دنیا کو چلانے والے طبقۂ خاص پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ قوت اور دباؤ کو آئی ایم ایف، عالمی بینک اور امریکی محکمہ خزانہ کی پشت پناہی حاصل ہے۔ کلرائے سلک کو ان الفاظ پر بی بی سی سے نکال دیا گیا لیکن معاہدہ اسی کی کمپنی کے پاس رہا۔ کولٹر اور کلرائے سلک جیسے لوگ تو انتہا کے قدامت پسند سہی لیکن لوگوں کا ایک اور طبقہ بھی موجود ہے جو اسلامی فاشزم کی بات کرتا ہے۔ یہ لوگ روشن خیال ہیں یا کبھی روشن خیال ہوا کرتے تھے۔ لیکن عرب دنیا میں سامراجی ہتھکنڈوں کو جواز دینے کے لیے ان خطوط پر کام کر رہے ہیں۔ اگر مشرق وسطیٰ میں بدھ مذہب کے لوگ بستے تو پھر آپ آج بدھ فاشزم پر حملے ہوتے دیکھتے اور ہالی ووڈ کے یہ سارے ڈائریکٹر جو بدھ ہونے کے دعوے دار ہیں اس امر سے منکر ہو جاتے۔ اس صورت میں یہ لوگ مسلمان ہو جاتے کیونکہ تب اسے زیادہ ایسوٹیرک (Esoteric) مذہب سمجھا جاتا۔

> اسلام اور مسلمانوں پر لعنت ملامت کی اس بوچھار میں ایک آواز محکمہ دفاع کے اعلیٰ افسر لیفٹیننٹ جنرل ولیم بائیکن کی بھی ہے جو کم وبیش بن لادن کا عکس نظر آتا ہے۔ وہ کہتا ہے، ''وہ ہم سے نفرت کیوں کرتے ہیں؟ اس لیے کہ ہم عیسائی قوم ہیں۔ اس لیے کہ ہم اہل ایمان ہیں۔ ہمارے روحانی دشمن کو فقط اس وقت شکست ہو گی اگر ہم ان کے خلاف مسیح کے لیے جنگ کریں گے۔'' وہ ابھی تک امریکی فوج میں اعلیٰ عہدیدار ہے۔

ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میں نے اپنی کتاب کا نام "The Clash of Fundamentalisims" رکھا ہے۔ آپ کے ہاں سامراجی بنیاد پرستی موجود ہے جس کے عین قلب میں دنیا کا مذہبی ترین ملک ہے۔ میرا خیال ہے کہ امریکہ دنیا کا مذہبی ترین ملک ہے۔ اسلامی دنیا کے زیادہ تر بڑے حصوں میں کٹر عقیدے کے قائل لوگوں کی تعداد امریکہ سے کہیں کم ہے۔

چونکہ اسلامی دنیا میں بہت کم لوگ اس کا اقرار کریں گے۔ چنانچہ شماریاتی جائزہ تو ممکن نہیں لیکن ہم میں سے جن لوگوں کا سفر کرنے یا رہنے کا تجربہ ہوا ہے وہ اس بات کو بخوبی

جانتے ہیں۔ لوگ نجی طور پر خاصے متشکک ہیں۔ ان میں صرف دانشور ہی نہیں بلکہ عام لوگ بھی شامل ہیں۔ دیہات میں نکل جائیں۔ لوگوں سے بات کریں۔ وہ ملا اور مذہب کے لطیفے بتائیں گے۔ میں نے اکثر پاکستانی کسانوں کو کہتے سنا ہے، ''بس اللہ کی مرضی ہے ہم پر اس سال بھی مہربان ہوتا ہے یا پچھلے سال کی طرح ہی رہتا ہے۔''

ریاست ہائے متحدہ میں مذہب کی گرفت کئی ایک اسلامی ممالک سے زیادہ ہے۔ بائیکن، بش اور ایش کرافٹ اسی رجحان کے نمائندہ ہیں۔ اس میں ڈیموکریٹک کے نمائندے بھی شامل ہیں۔ کلنٹن بھی چرچ جایا کرتا تھا۔ کیری کا پتہ نہیں لیکن جو کچھ اسے کرنا پڑا وہ بھی کرے گا۔ اگر وہ اسے کہتے ہیں، ''جاؤ اور ہر اتوار کو چرچ میں عبادت کرو۔ اس طرح جیتنے کا امکان بڑھ جائے گا'' وہ یہ سب کرے گا۔ اگر وہ اسے کہتے ہیں کہ یہودی عبادت گاہ میں جاؤ تو کچھ زیادہ ووٹ مل جائیں گے۔ وہ یہ بھی کرے گا۔ وہ تو مسجد میں بھی جا سکتا ہے۔ جارج بش بھی تو مسلمان رہنماؤں سے ملتا ہے۔''

ستم ظریفی یہ ہے کہ اس ملک میں رہنے والے اور جنوبی ایشیائی ممالک سے آئے ہوئے بعض قدامت پسند مسلمان امریکی 11 ستمبر کے وقوعے تک ریپبلکن کے حمایتی تھے اور اس کی وجوہات بڑی دلچسپ ہیں۔ اول تو ان کا خیال تھا کہ ڈیموکریٹوں کے مقابلے میں ریپبلکن اسلامی دنیا کے حوالے سے کم سخت ہیں۔ یہ بات غلط ثابت ہو چکی ہے۔ البتہ دوسری وجہ زیادہ حقیقی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اسقاط حمل، ہم جنسیت اور کھلے جنسی تعلقات کے مخالف ریپبلکن ان کے عقائد کے زیادہ قریب ہیں۔ یوں ریاست ہائے متحدہ میں دائیں بازو کے عیسائیوں اور مسلمانوں کے مابین ایک طرح کی قربت موجود تھی۔ لیکن 11 ستمبر کے بعد اسلام کے خلاف جارحانہ رویے نے دونوں کے درمیان فاصلہ پیدا کر دیا۔

آج کے امریکہ اور یورپ کے درمیان بڑا فرق مذہب کا ہے۔ یورپ مذہبی نہیں ہے۔ دونوں کے درمیان سیاست اور اقتصاد پر موجود فرق نسبتاً بہت تھوڑا ہے۔ یورپی لوگ امریکی مذہبیت پر متذبذب ہو جاتے ہیں اور امریکہ پر مذہب کی گرفت کو سمجھ نہیں پاتے۔

فلسطین کے متعلق کچھ اور بات کی جائے اور بتائیں کہ یہ لوگوں کے ذہن پر کیوں اتنا سوار ہے۔ مثال کے طور پر ملتان، پاکستان، کا ایک تاجر یا چٹا گانگ، بنگلہ دیش، کا ایک قلی یا جاوا، انڈونیشیا، کا چاول کا ایک غریب کاشتکار فلسطین کی بات کیوں کرتا ہے؟

لازم نہیں کہ اس کی وجہ مذہب ہی ہو۔ آپ نے بہر حال بڑے مختلف تمدنوں کی بات کی ہے۔ اسرائیلی مقبوضہ فلسطین میں انہیں دہرے معیارات کارفرما نظر آتے ہیں۔ ایک اور عرب ملک پر بھی حملہ ہوا ہے اور اس پر بھی غیر ملکی فوجوں کا قبضہ ہے۔ محض اس مفروضہ کی بنیاد پر کہ اس کے پاس بڑے پیمانے کی تباہی پھیلانے والے ہتھیار ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ دیکھتے ہیں کہ ایک اور ہمسایہ ملک اپنے پاس اسی طرح کے ہتھیاروں کے موجود ہونے کا اقراری ہے اور خطہ کا واحد ملک ہے جو انہیں استعمال بھی کرتا ہے اور وہ دیکھتے ہیں کہ یہ ملک اسرائیل اپنے مقبوضہ علاقوں میں فلسطینی آبادی کو بنیادی انسانی حقوق دینے پر بھی تیار نہیں۔ اس پر لوگ غصہ کھاتے ہیں اور انہیں اس سامراجی قوت پر غصہ آتا ہے جو عراق پر حملہ کرتے ہوئے تو جھوٹے معیارات کو وجہ بناتی ہے جبکہ انہیں چیزوں کی اسرائیل میں موجودگی سے آنکھیں بند کر لیتی ہے کہ وہ عرصہ سے اس کا اتحادی چلا آ رہا ہے۔ اگر ریاست ہائے متحدہ یا مغرب اسرائیل کے خلاف پابندیاں لگاتے۔ اس کی ہر طرح کی امداد بند کر دیتے۔ اور 1967ء کی سرحدوں پر واپس جانے تک اس کی ناکہ بندی کیے رکھتے تو یہ غصہ وجود میں نہ آتا۔ دہشت گردی کی طرف مائل ہونے والے بعض بچے بھی اس میں دلچسپی کھو بیٹھتے۔ انہیں پتہ چل جاتا کہ دنیا میں کوئی ان کے لیے بھی کچھ کر رہا ہے۔

فلسطینیوں کے ساتھ یکجہتی کی تحریک موجود ہے لیکن سیاسی طبقوں کی سطح پر نہیں۔ خود ریاست ہائے متحدہ اور یورپ میں بہت سے مسلمان صورتحال پر غم وغصہ کا اظہار کرتے ہیں۔

ایچل کوری کا نام فلسطین میں لافانی ہو چکا ہے۔

وہی امریکی نوجوان عورت جسے غزہ میں اسرائیلی بلڈوزر نے کچل ڈالا تھا۔

اسرائیلی بلڈوزر نے اسے جان بوجھ کر قتل کیا تھا۔ یہ حادثہ نہیں تھا۔ یہ فلسطین آنے والے مغربی بچوں کو پیغام دینے کا اسرائیلی طریقہ تھا کہ ہم تمہارے ساتھ بھی وہی سلوک کریں گے جو فلسطینیوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ تم آ کر فلسطینیوں کے شانہ بشانہ کھڑے ہوتے ہو اور تمہیں بھی قتل کر دیا جائے گا۔ ریچل کوری واحد شکار نہیں تھی۔ نوجوان برطانوی شہری ٹوم ہرنڈال کو غزہ میں گولی ماری گئی اور وہ عرصہ تک قومے میں رہنے کے بعد چل بسا۔ اسرائیلیوں کا طریقہ کار یہی ہے۔ وہ اپنے گھروں کو منہدم ہونے سے بچاتے فلسطینیوں کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑے رہتے ہیں اور مار دیئے جاتے ہیں۔

MashalBooks.com

اسرائیل نے اپنے سفارت خانوں کو صیہونی ریاست کی پروپیگنڈا مشینیں بنا دیا ہے کہ دنیا میں یہود خلاف لہر ایک بار پھر اٹھی ہے۔ حالانکہ یہ سب غلط ہے۔ دنیا کے بعض علاقوں میں یہود خلاف جذبات موجود ہیں لیکن انہیں اسرائیل خلاف جذبات نہیں کہا جا سکتا۔ اگر آپ فلسطین میں اسرائیل کی عقوبت، بچوں کے قتل اور علاقوں پر قبضے پر تنقید کرتے ہیں اور فلسطینی زمین پر نوآبادکاری کی مخالفت کرتے ہیں تو آپ یہود خلاف سمجھے جائیں گے۔ اگر آپ یہودی ہیں تو پھر آپ کو خود سے متنفر یہودی کہا جائے گا۔ پورے یورپ میں موجود اسرائیلی سفارتخانے اس پروپیگنڈے میں مصروف ہیں۔ کیونکہ یورپیوں کو فلسطینیوں سے قدرے ہمدردی ہے۔ ریاست ہائے متحدہ میں اسرائیل کو اس تردد کی ضرورت نہیں۔ اس لیے کہ ایوان نمائندگان اور سینیٹ دونوں نے اسرائیل کی حمایت کے بلینک چیک پر دستخط کر رکھے ہیں۔ وہ اس طرح کہ غیر مشروط حمایت اپنی حکومت کی بھی نہیں کرتے۔

آپ کا اس دلیل کے متعلق کیا خیال ہے کہ کئی عرب امارات کے جابر حکمرانوں کے لیے اسرائیل ایک سہولت بن گیا ہے اور وہ اسے اپنی کوتاہیوں اور جبر سے توجہ ہٹانے کے لیے استعمال کرتے ہیں؟

یہ سچ ہے کہ ان ملکوں میں بھی حقیقت بیں لوگوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ سعودی عرب میں سعودی بادشاہت زیادہ مقبول نہیں رہی۔ مصری حکومت خود اپنے ملک میں مقبول نہیں اور اسی وجہ سے یہ حکومت آزادانہ انتخابات نہیں کرواتی کہ ہار جائے گی۔ یہ جو چھوٹی چھوٹی عرب ریاستیں ہیں جنہیں اصل میں چھوٹے چھوٹے پٹرول سٹیشن کہا جا سکتا ہے۔ وہاں کے شیخ بھی اپنے عوام میں مقبول نہیں۔ بس یہ کہ ان پٹرول سٹیشنوں کو غیر ملکی فوج اپنے گھیرے میں لیے ہوئے ہیں۔ امریکی سرزمین سے باہر امریکہ کا سب سے بڑا فوجی اڈہ قطر میں ہے۔ جس کی آبادی لاس اینجلس سے بھی کم ہے۔ وہاں موجود اڈے العدید پر سے جدید ترین ہوائی جہاز بغداد تک پر بمباری کے لیے اڑتے ہیں۔

امریکیوں کو صرف تیل کے بہاؤ سے غرض ہے۔ انہیں ہر وہ حکمران قبول ہے جو تیل کے بہاؤ کی ضمانت دے سکتا ہے۔ سعودی اس شرط پر پورے اترتے ہیں اور خلیج کے شیخ بھی۔ کچھ عرصہ صدام نے بھی یہی کیا لیکن پھر امریکیوں سے جھگڑ پڑا۔ ایران بھی عرصہ سے ان کا ساتھ نہیں دے رہا۔ یہ جنگ ہے جو ہو رہی ہے۔ میں نے اپنی کتابوں میں اس خطے میں ہونے

والی جنگوں کو تیل کی جنگ کہا ہے۔ مسلم خطہ میں یہ لڑائیاں دو سامراجی قوتیں امریکہ اور برطانیہ لڑ رہے ہیں۔ اس انتظام میں اسرائیل کو نہایت اہم حیثیت حاصل ہے۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں کہ سعودیوں اور دیگر حکومتوں نے اسرائیل کو اپنے لوگوں کی توجہ بھٹکانے کے لیے استعمال کیا ہے۔ اور لوگوں کو یہ بتانے کے لیے کہ وہ امریکی عزائم کے خلاف سرگرم ہیں۔ جب عملی اقدامات کی باری آتی ہے تو یہ حکمران پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔

چند سال پہلے عرب سربراہی کانفرنس پر مظفر النواب نے ایک بڑی طنزیہ نظم لکھی تھی۔ بہت سے لوگوں نے اعتراض کیا کہ یہ بڑی زہرناک نظم ہے۔ بعض لوگوں نے اسے غیر مہذب بھی قرار دیا۔ وہ دکھاتا ہے کہ عرب رہنما اپنی سربراہی کانفرنس میں بھیڑوں، مینڈھوں اور بکریوں کی طرح جمع ہوتے ہیں۔ ایک جگہ وہ دکھاتا ہے کہ ایک بکری کانفرنس چیمبر میں داخل ہو کر پیشاب کرنے لگتی ہے وہ سب پیشاب کا جائزہ لیتے ہیں کہ آہ! بکری نے پیشاب کر دیا۔ کیسی دلچسپ بات ہے۔ آؤ اسے اور قریب سے دیکھیں۔ اس کا جائزہ لیں۔ یوں یہ نظم آگے چلتی ہے۔ ابھی تازہ ترین سربراہی کانفرنس جو ہونے والی تھی منسوخ کر دی گئی کہ رہنماؤں میں اس امر پر ہی اتفاق نہیں تھا کہ کانفرنس ہونی بھی چاہیے یا نہیں۔ تب مجھے یہ نظم یاد آئی تھی۔ عرب رہنماؤں کی تو یہی حالت ہے۔ ظاہر ہے کہ مغرب بھی ہمیشہ مداخلت اور در اندازی کر رہا ہے لیکن کہنا پڑتا ہے کہ عرب رہنماؤں نے اکثر اپنے باہمی جھگڑوں میں الجھ کر اپنے فرائض سے غفلت برتی۔ پچاس اور ساٹھ کے عشرے میں برابر اہمیت کے تین دارالحکومتوں یعنی قاہرہ، دمشق اور بغداد کی حامل متحدہ عرب ریاست بنانے کا سنہری موقع موجود تھا لیکن استفادہ نہ کیا گیا۔ اس کی قیمت دینا پڑ رہی ہے۔

> ذرا اس پر بات ہو جائے کہ فلسطینی قومی تحریک کے کن عناصر نے اسے محدود کیا اور یہ داخلیت کا شکار ہو گئی۔ اور یوں اس میں نوآبادیات کا رنگ آیا۔ بالخصوص اس حوالے سے کہ فلسطینی مسلسل اپنے دشمن کے بڑے سرپرست سے درخواست کر رہے ہیں کہ انہیں آزادی دلائی جائے۔

ایڈورڈ سعید نے اوسلو کو فلسطینیوں کا ورسائی قرار دیا تھا جہاں انہوں نے چند مراعات کے بدلے بنیادی طور پر سرنگوں کر دیا تھا۔ فلسطینی قیادت کا خیال تھا کہ یوں انہیں ایک چھوٹی سی ریاست مل سکے گی جو کم از کم چل تو سکے گی۔ لیکن انہیں وہ بھی نہ ملی۔ اسرائیل فلسطینیوں کو فقط ایک ننھا سا بنتوستان دینے پر آمادہ ہوا۔ عرفات اور اس کے ساتھیوں نے اوسلو کے دورانیہ

میں اپنی آبادی اور باقی دنیا کو کسی طور پر یہ باور نہ کروایا کہ "ہمیں اس کی توقع تھی اور یہ بھی نہیں ملا۔" اس کی بجائے وہ لوگ مال بنانے میں مصروف رہے اور اس مقصد کے لیے انہوں نے فلسطین میں مختلف منصوبوں کے لیے ملنے والی رقم کو ری سائیکل کیا۔ وہ خود اپنے ملک کو لوٹتے رہے۔

دوسرے دن انتفاضہ محض صیہونی تسلط کے خلاف نہیں تھا بلکہ یہ فلسطینی رہنماؤں کی بدعنوانی کے خلاف احتجاج بھی تھا۔ اگر شیرون نے عرفات کے خلاف اپنی تازہ جارحیت نہ کی ہوتی تو ہو سکتا تھا کہ [illegible] میں اسے ووٹ مار دیتے۔ اسرائیلیوں نے اس کی بجلی کاٹی اور اسے دوبارہ ہیرو بنا دیا۔ موم بتیوں کی روشنی میں یاسر عرفات ریمبراں کی تصویروں میں بنا کوئی کردار نظر آتا۔ اس حملے کے بعد لوگوں نے اسے پھر مہلت دے دی۔

آپ کا سوال خاصا اہم ہے۔ ہم نے ایک سیکولر فلسطینی قیادت امریکہ بھجوا کر ایک غلط فیصلہ کیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شدت پسند حزب اختلاف کی قیادت مذہبی گروپ حماس کے ہاتھ میں ہے۔ ان کے بہت سے حربوں سے اختلاف کے باوجود میں ان کا دفاع کرتا ہوں۔ کیونکہ وہ فلسطینیوں کو روز مرہ کے ظلم و تشدد سے بچانے والا واحد گروپ ہے۔ لیکن ایمانداری سے دیکھا جائے تو اتنی شدید مذہبی قیادت فلسطینیوں کے مفاد میں نہیں۔ اس لیے کہ دیگر وجوہات کے ساتھ ساتھ فلسطین میں فقط مسلمان نہیں بستے۔ وہاں بہت سے عیسائی بھی ہیں اور ہم انہیں الگ نہیں کرنا چاہتے۔

لیکن پی ایل او نے اوسلو پر سمجھوتہ کرنے کی خوفناک غلطی کی۔ کیمپ ڈیوڈ کے ڈرامے میں شمولیت بھی ایسی ہی غلطی تھی۔ جب میں اس کانفرنس کی تصویر دیکھتا ہوں تو کلنٹن اور بارک عرفات کے ساتھ اسی پدریت کا سلوک کرتے نظر آتے ہیں جو وڈیروں نے اپنے چہیتے مزارعوں کے لیے مخصوص کر رکھا ہوتا ہے۔ عرفات کو پتہ چلا کہ اسے کچھ ملنے کا نہیں تو اس نے وہاں سے نکلنا چاہا لیکن کلنٹن اور بارک اسے روکنے میں کامیاب ہو گئے۔ فلسطینی رہنما یہ سب دیکھ رہے تھے۔ لیکن کسی متبادل طریقے تک نہ پہنچ پائے۔

جب اسرائیلی اوسلو میں گفت و شنید کے لیے آمادہ ہوئے تو ان کا اصرار تھا کہ یہ گفتگو پی ایل او کے ساتھ ہو گی۔ جو اس وقت تیونس میں جلا وطن تھی اور پہلا انتفاضہ چلانے والی مقامی قیادت میں شامل نہیں تھی۔ پی ایل او نے اسرائیل کو اوسلو پر رضامند نہیں کیا تھا بلکہ پہلے انتفاضہ کی قیادت نے انہیں اس پر مجبور کیا تھا۔ یہ مقامی قیادت ایماندار تھی اور اسے بددیانتی پر

مائل کرنا مشکل تھا۔ مغربی کنارے میں موجود پی ایل او کے رہنما بھی تیونس کی جلاوطن قیادت سے مختلف تھے۔ اسرائیلیوں نے پی ایل او کے ساتھ مذاکرات کا فیصلہ کیا تو اسرائیل کے اندر سرگرم پی ایل او اور غیر پی ایل او رہنما عرفات کی سربراہی قبول کرنے پر مجبور ہو گئے۔ آج بھی جب آپ عرفات کے ترجمان کو ٹی وی پر بات کرتے دیکھتے ہیں تو ان کی جسمانی حرکات وسکنات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے آقاؤں کو خوش کرنا چاہتے ہیں کہ دیکھو ہم کتنے معقول لوگ ہیں۔ ہمیں دیکھو ہم کیسے گھٹنوں کے بل چلتے تمہارے حضور میں آئے ہیں۔ ہم تو گھٹنوں کے بل کھڑے ہیں اور اسرائیلی پھر بھی ہمیں ٹھوکر مارتے ہیں۔ تو یہ فلسطینی رہنما اس سطح پر اتر آئے۔

فلسطینیوں کو بڑی شدت سے قومی قیادت کی ضرورت ہے جو اس ملک کے لیے زور و شور سے جدوجہد کرے گی۔ امید ہے کہ اس صدی کے آخر تک ایک فلسطینی ریاست دیکھنے کو ملے گی۔ ایک ایسی ریاست جس کی اپنی سرحدیں ہوں گی اور عظیم تر اسرائیل کی پرانی ریاست کے کم از کم نصف پر محیط ہو گی۔ یعنی وہ ایک بامعنی ریاست ہو گی۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو پھر فلسطینی، فلسطین اسرائیل متحد ریاست میں مساوی حیثیت کے شہری بن جائیں گے۔ صیہونی رہنماؤں کو یہ دونوں باتیں منظور نہیں اور یہی ان کی کمزوری ہے۔ کسی ایسی چیز کو ہمیشہ کے لیے نہیں روکا جاسکتا۔

> اپریل 2004ء میں شیرون واشنگٹن آیا تو امریکہ نے مغربی کنارے کے بڑے حصے اور اس کے نہایت قیمتی آبی چشمے کے الحاق پر صاد کر دیا۔ ہمیں پانی کے ان سرچشموں کو نہیں بھولنا چاہیے۔ شام کی گولان ہائٹس کا ذکر تک نہ ہوا اور نہ ہی مشرقی یروشلم کا جسے اسرائیل نے بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ضم کر لیا تھا۔

بین الاقوامی قانون کا ذکر کرتے ہوئے احتیاط کرنا ہو گی آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔ اس سارے عمل کی مذمت میں اقوام متحدہ کی قرار دادیں موجود ہیں۔ بین الاقوامی قانون تبھی مؤثر ہوتا ہے جب دنیا کی طاقتور ترین ریاست ایسا چاہتی ہے۔ بصورت دیگر نہیں۔ چنانچہ میں نہیں سمجھتا کہ فلسطینیوں کو اس قانون سے کچھ مدد ملے گی۔ چنانچہ انہیں کسی نہ کسی لمحے پر فیصلہ کرنا ہو گا کہ وہ اپنے حقوق ملنے تک دنیا کے اس حصے کو ناقابل حکومت بنا دے۔

تاریخی اعتبار سے یونائیٹڈ فرنٹ کا ایک تصور چلا آ رہا ہے۔ اگر اقوام متحدہ اور ملکوں کا

کوئی حقیقی اتحاد سامراج کی مزاحمت کے لیے بن جاتا ہے تو کیا ہوگا؟ کیا وہ مؤثر ہوگا؟

بالکل۔ لیکن فقط اس وقت جب امریکی سلطنت کے خلاف کم از کم ایک بلاک بن جاتا ہے۔ خواہ وہ مشرق بعید میں بنتا ہے یا کہیں اور۔ ضروری ہے کہ یہ فرنٹ فلسطینیوں یا عراقیوں کو کچھ تحفظ مہیا کرے۔ اگر لاطینی امریکی ریاستیں اور ایشیائی اور جنوبی ایشیائی ریاستیں کہتی ہیں، ''ہمیں ریاست ہائے متحدہ کے کہنے سننے کی پرواہ نہیں اور ہم فلسطینیوں کی مدد کر رہے ہیں۔ ہم وہاں رضا کار بھیجیں گے اور انہیں ہتھیار فراہم کریں گے۔'' تو پھر فرق پڑتا ہے۔ انہیں ایسا کیوں کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ یہ بیسویں صدی کی آخری نوآبادیاتی جدوجہد ہے۔ اسی صورت میں مشرق وسطیٰ کی صورتحال بدلے گی۔

لیکن فلسطین کے گرد واقع عرب حکومتیں بھی فلسطینیوں کی جدوجہد میں ان کا ساتھ نہیں دیتیں اور یوں باقی دنیا پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔ اگر عرب دنیا میں کچھ دم ہوتا اور انہوں نے باقی دنیا سے اپیل کی ہوتی تو کچھ ہوسکتا تھا لیکن انہوں نے کچھ نہیں کیا۔ یہ صورتحال دیکھ کر بعض اوقات میں خاصا مایوس ہو جاتا ہوں اور پھر سوچتا ہوں کہ آگے فقط ایک رستہ جمہوری انقلابوں کا ہے۔ یعنی ایسے انقلاب جو خطے کے باسیوں کی خواہشات کے آئینہ دار ہوں اور خطے کے ممالک پر مسلط نااہل حکمرانوں کو نکال باہر کریں۔ پھر صورتحال راتوں رات بدل جائے گی۔ واشنگٹن کو اس مسئلے کا سامنا ہوگا کہ اسرائیل کی پشت پناہی جاری رکھے یا نئی قیادت کے ساتھ تعلقات بنائے۔ امریکہ کے بائیں بازو کے حلقوں میں ایک لطیفہ چلتا ہے کہ اگر کبھی امریکیوں کو اپنے سامراجی عزائم کے لیے اسرائیل کو دفنانا پڑے تو صرف دو افراد اسرائیل کی حمایت میں کھڑے رہیں گے ایک نوم چومسکی اور دوسرا نارمن فنکل سٹین۔

> ریاست ہائے متحدہ میں بالعموم اور اس کے روشن خیال حلقے بالخصوص فلسطین پر کوئی بات کرنے سے بچتے ہیں۔ میں آپ کو کچھ پڑھ کر سنانا چاہتا ہوں جو ایڈورڈ سعید نے اپنے عزیز دوست، پاکستانی دانشور اور سیاسی مبصر اقبال احمد کے متعلق لکھا تھا جو فلسطین میں بہت سرگرم رہا۔ سعید نے لکھا ''کتنے دوست اس موضوع سے بچتے ہیں، کتنے فلسطین کے تنازعے سے کچھ واسطہ نہیں رکھتے، کتنے روشن فکر ہیں جن کے پاس بوسنیا، صومالیہ، جنوبی افریقہ، نکاراگوا، غرض یہ کہ زمین پر ہر کہیں انسانی و جمہوری حقوق کے لیے وقت موجود ہے لیکن صرف فلسطین اور فلسطینیوں کے لیے نہیں ہے۔''

ایڈورڈ بالکل درست کہتا ہے اور یہ بات قابل غور ہے اور بالخصوص 1967ء سے قابل غور چلی آ رہی ہے۔ اس سے پہلے بھی کچھ زیادہ لوگ فلسطین کا ذکر نہیں کرتے تھے۔ لیکن 1967ء کے بعد تو روشن خیال حلقے میں بھی خاصی کمزوری آئی ہے۔ میں بائیں بازو کا ذکر نہیں کرتا جس نے یورپ میں فلسطینیوں کا ذکر جاری رکھا۔ بائیں بازو کے بہت سے لوگوں نے فلسطینیوں کا دفاع کیا ہے اور اب بھی کر رہے ہیں۔ ان حلقوں میں یہودی الاصل بھی شامل ہیں۔

فلسطین کے موضوع پر میری تعلیم بھی پاکستان میں نہیں ہوئی۔ میری نوخیزی کے زمانے میں فلسطین کا شاید ہی کبھی ذکر کیا جاتا تھا۔ اس لیے کہ تب پاکستان امریکی دفاعی معاہدوں بغداد پیکٹ اور پھر سیٹو کا رکن تھا۔ اس دنیا میں فلسطین کا شاید ہی کبھی ذکر ہوتا تھا۔ ہم اس بارے میں خاصے بے خبر تھے۔ فلسطینیوں پر ہونے والے ظلم وتشدد کی حقیقی نوعیت کا پتہ یہودی الاصل انقلابیوں سے چلا۔ ساٹھ کے عشرے میں ان لوگوں نے میری نسل کو اس کے متعلق معلومات فراہم کیں۔ یہ لوگ سخت صیہونیت خلاف تھے۔ اب بھی ان میں سے بہت سے موجود ہیں اور اسرائیل کے پہلے سے بھی زیادہ خلاف ہیں۔ چنانچہ فلسطینیوں کا دفاع کرنے والی ایک چھوٹی سی اقلیت اب بھی موجود ہے۔

لیکن اب عراق کے ساتھ ساتھ فلسطینی جدوجہد دنیا کا مرکزی نقطہ ہونا چاہیے۔ بہت سے لوگ عالمی سیاسیات میں اسے اب بھی یہ مقام دیتے ہیں۔ لیکن یورپ اور امریکہ میں موجود بہت سے لوگ جو عراق پر قبضے کے خلاف ہیں فلسطین کا ذکر ہی نہیں کرتے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے اس کی بڑی وجہ تھرڈ ریخ کے مظالم کا احساس جرم ہے جو اس نے یہودیوں پر کیے۔ باقی لوگ ریاست ہائے متحدہ کو ناراض نہیں کرنا چاہتے۔

اس کی وجہ محض یہودی لابی کی قوت نہیں جو واقعی بہت طاقتور ہے۔ ریاست ہائے متحدہ میں بیشتر لوگ سمجھتے ہیں کہ اسرائیل مشرق وسطیٰ میں مغربی مفادات کا ایک نخلستان ہے اور اس حوالے سے یہ ہماری طرح کا ہے۔ یہ بات بڑی حد تک درست بھی ہے کیونکہ اسرائیل میں بسنے والے تارکین وطن کی ایک بڑی تعداد یورپ سے گئی تھی لیکن بہت سے یہودی امریکہ سے بھی وہاں پہنچے۔ جب وہ لوگ ٹی وی پر آتے ہیں تو ان کا لہجہ تک امریکی ہوتا ہے اور امریکی لوگ انہیں اپنے ساتھ متشخص کرتے ہیں۔

لوگ اسرائیل کی اس لیے بھی مذمت نہیں کرتے کہ امریکہ، بش اور کلنٹن کی پالیسیوں کی

مذمت کیے بغیر یہ ممکن نہیں۔ امریکی آبادی کا بڑا حصہ دیگر مسائل کے ساتھ ساتھ حقائق سے آگہی کی تلخی سے مامون ہے۔ جبکہ سیاسی، ثقافتی اور ابلاغ کا بالائی طبقہ اسرائیل کا حمایتی ہے۔ مثال کے طور پر ڈیموکریٹ صدارتی امیدوار جان کیری نے اسرائیل کے سوال پر کہا کہ وہ سو فیصد بش کے ساتھ متفق ہیں۔ حماس کے رہنماؤں کی ہلاکت کے حوالے سے وہ بش سے بھی آگے نکل گیا۔ کیری نے بیان دیا کہ وہ اسرائیل کا دورہ کرنے کے بعد بڑا متفخر ہے کہ اس نے اسرائیلی بمبار میں پرواز کی اور دیکھا کہ نیچے زمین کیسی نظر آتی ہے۔ اس کے نزدیک فلسطینی اور ان کے حقوق کی خلاف ورزی قابل ذکر ہی نہیں تھی۔ جب دنیا کی سب سے بڑی اور طاقتور ترین ریاست کے سیاست دانوں کا یہ حال ہے تو فلسطینی قیادت ان کے ساتھ کیوں امیدیں وابستہ رکھتی ہے؟ وقت کے ساتھ ساتھ ایسی قیادت بھی ابھرے گی جو امریکہ سے لاتعلق ہو جائے گی۔ تب کہیں جدوجہد بہتر ہو گی اور ہمیں امریکی رائے عامہ میں بھی تبدیلی نظر آئے گی۔

(Palestine National Initiative) یعنی پی این آئی کے نام سے ایک تنظیم موجود ہے۔ اس میں مصطفیٰ برغوتی سرگرم ہے۔ اس کے بانیان میں سے ایک ایڈورڈ سعید تھا۔ یہ تنظیم جمہوری اور سیکولر ہے۔ میری دلچسپی اس امر میں ہے کہ ہمارے خیالات کے حامل لوگ بھی پروپیگنڈے کی اصطلاحات استعمال کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہم وہاں موجود کالونیوں کو ''آبادیاں'' اور وہاں بسنے والوں کو ''آبادکار'' کہتے ہیں جو کم از کم امریکہ میں بڑی خوش کن اصطلاحات ہیں۔ اس وقت ہم امریکی ویسٹ میں بیٹھے ہیں جسے پہلے پہل آنے والوں نے آباد کیا اور انڈینوں کو شکست دی۔

یہ درست ہے اور ہم سب اس جرم میں شریک ہیں۔ جب میں لفظ ''آبادکار'' استعمال کرتا ہوں تو میرے ذہن میں امریکہ نہیں ہوتا کیونکہ میں یہاں رہتا نہیں بلکہ میرے ذہن میں الجیریا کے فرانسیسی آبادکار یا جنوب مشرقی ایشیا کے ڈچ آبادکار ہوتے ہیں جنہیں شکست ہوئی تھی۔ یورپ میں بسنے والے ہم جیسے بہت سے لوگ یہ لفظ اس امید میں استعمال کرتے ہیں کہ بالآخر انہیں بھی جنوبی افریقہ کے بوئروں اور الجیریا کے آبادکاروں کی طرح شکست ہو گی۔ الجیریا کے فرانسیسیوں اور جنوبی افریقہ کے ڈچوں کو اسرائیلی آبادکاروں کے ساتھ نہیں

ملایا جا سکتا۔ ان کے مابین ایک بڑا فرق موجود ہے۔ اگر انہیں نکال دیا جاتا تو ان کے پاس واپس جانے کی جگہ موجود تھی۔ فرانسیسی واپس فرانس کو چلے گئے اور ڈچ بھی واپس ہالینڈ جا سکتے تھے۔ یعنی ان کے پاس جگہ موجود تھی۔ یہودیوں کے پاس اب ایسی کوئی جگہ نہیں۔ یہاں سے جا کر فلسطینیوں پر مسلط ہونے والے یہودی تو واپس آ سکتے ہیں لیکن اسرائیلیوں کی بڑی تعداد کے پاس پسپائی کی صورت میں کوئی جگہ موجود نہیں۔ باقی عرب دنیا کی طرح یہ بات فلسطینی رہنماؤں نے بھی جان لی ہے۔ اب کوئی اسرائیلیوں کو دھکیل کر سمندر میں پھینکنے کی بات نہیں کرتا اور نہ ہی پچاس کے عشرے کے یہ نعرے اب سنائی دیتے ہیں۔ چنانچہ صیہونی بھی نہیں کہہ سکتے کہ ہم چھوٹی سی قوم ہیں اور وہ ہمیں سمندر میں دھکیلنا چاہتے ہیں۔ لوگوں نے مان لیا ہے کہ یہ ہمارے ساتھ ہی رہیں گے۔ اصل بات اکٹھے رہنے کا طریقہ ہے۔ اسرائیلی اسے بھی ماننے کو تیار نہیں۔ اگر آج اسرائیلی رہنما اپنے کیے پر معذرت کر لیتے ہیں تو اس سے بہت فرق پڑے گا۔ لیکن وہ ایسا نہیں کریں گے۔

ایک نہایت رجعت پسند اسرائیلی مؤرخ بنی مورس نے جو واقعی ایک سنجیدہ مؤرخ ہے ہیئرٹز (Ha'artez) کا انٹرویو کیا جس کا ترجمہ ہم نے ''نیو لیفٹ ریویو'' میں چھاپا۔ وہ کہتا ہے کہ ہم نے لسانی صفائی کی ہے۔ کوئی ایک ملین لوگوں کو نکالا بھی ہے۔ زیادتی بھی ہوئی ہے۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے؟ دوسرے ان سارے وقوعوں سے انکار کرتے ہیں۔ مورس اسے مانتا ہے کیونکہ وہ انکار نہیں کرنا چاہتا۔ وہ کہتا ہے کہ اسرائیلی ریاست بنانے کے لیے ضروری تھا۔ بلکہ اسے افسوس ہے کہ جب یہ ہو سکتا تھا تب تمام فلسطینیوں کو کیوں نہ نکالا گیا۔ وہ قرار دیتا ہے کہ یہ اسی طرح کا عمل ہے جیسے امریکہ پہنچنے والوں نے وہاں کے مقامیوں کو نکال دیا تھا۔ اور بنی کو اس تقابل پر کوئی شرمندگی بھی نہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ یہ ایک ارفع تر تہذیب کا نوآبادیاتی منصوبہ تھا۔ بنی مورس کے والدین انگریز یہودی تھے چنانچہ لگتا ہے کہ اس کا یہ اندازِ فکر برطانوی سلطنت کا حصہ ہے۔ بنی مورس اسرائیل کے نمایاں اور سینئر ترین مؤرخین میں سے ایک ہے۔ بائیں بازو کے اسرائیلی مؤرخین نے اس کی مذمت کی اور صیہونی مقتدرہ بھی اس پر کلبلائی۔ اس کا نقطۂ نظر اپنی جگہ لیکن اس نے ایک کام بہت اہم کیا ہے کہ یہ سارا کچھ احاطۂ تحریر میں لے آیا کہ اسرائیلی عمل اور مقامی انڈینوں کو نکال باہر کرنے کا عمل ایک جیسا ہے۔ خود میرے جیسے لوگ بھی یہ تقابل کرتے تھے اور اسرائیلی اسے تہمت گردانتے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہم تو فلسطینیوں پر بہت مہربان ہیں لیکن وہ ہماری سنتے نہیں۔ ہم نہیں لڑتے، فلسطینی ہم پر

MashalBooks.com

بم مارتے ہیں۔ ہم نے ان کے ساتھ کبھی کچھ نہیں کیا۔ ہم تو چاہتے ہیں وہ ہمارے ساتھ امن سے رہیں۔ لیکن ان کی یہ دلیل بے وقعت ہوگئی ہے۔

آپ کا اس روایتی صیہونی دلیل کا کیا جواب ہے کہ عربوں کی تو بیس ریاستیں ہیں جبکہ یہودیوں کا صرف ایک ملک ہے؟ عرب ریاستوں کو چاہیے کہ انہیں اپنے معاشروں میں ضم کرلیں جبکہ صرف اردن نے انہیں اپنی شہریت پیش کی ہے؟

سوال یہ ہے کہ فلسطینیوں کو کہیں اور آباد ہونے پر مجبور کیوں کیا جائے؟ دنیا کے باقی لوگوں کی طرح انہیں بھی اپنے دیہات اور اپنی زمینوں پر کیوں نہ بسنے دیا جائے؟ انہیں ان کے گھروں سے جبراً نکالا گیا۔ یہ لوگ کب نکلنا چاہتے تھے۔ مساوی حقوق کی بنیاد پر یہ بخوشی اسرائیلیوں کے ساتھ رہنے کو تیار ہیں۔ بشرطیکہ انہیں مستقلاً بدسلوکی، تعذیب اور قید و بند کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اس میں برائی کیا ہے؟ بقائے باہمی میں یہودیوں کی تمدنی روایت نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔ یہ صورتحال تو صیہونیت اور بعض بنیاد پرست یہودیوں نے پیدا کی ہے۔ کوئی بھی عرب ریاست کبھی خالص مسلم ریاست نہیں رہی۔ سب میں قابل ذکر تعداد میں عیسائی بھی آباد تھے۔ قاہرہ اور بغداد میں یہودیوں کی ایک بڑی تعداد بستی تھی۔ ان کا کیا بنا؟ کچھ بھی نہیں، حتیٰ کہ اسرائیل بن گیا۔ اور انہوں نے یہودی وہاں منگوا لیے۔ انہیں لوگوں نے بغداد کے یہودیوں کو فکر مند کرنے کے لیے ریستورانوں میں دھماکے کروائے تاکہ یہ لوگ اسرائیل کا رخ کریں۔ میرا خیال ہے کہ ایسی بنیاد پر قائم ہونے والی ریاست خواہ وہ غلط طور پر قائم ہوئی یا صحیح طریقے سے لیکن اس طرح کی گھیٹو سٹیٹ میں رہنا یہودیوں کی اکثریت کے مفاد میں بھی نہیں۔ یہ لوگ تمام عمر گھیٹو میں گزار دیں گے۔ ساری زندگی گھیٹو سے نکل کر دوسرے لوگوں میں مدغم ہونے کی کوشش کرتے رہیں گے۔ تب گھیٹیوں میں آباد یہودیوں کو فکر لاحق ہوئی کہ دنیا میں ایسے خطے میں اپنی ریاست بنائیں جو ان کا نہیں ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس اصول پر بات کرنے کی ضرورت ہے کہ ہر ملک کو کثیر ثقافتی ہونے کا حق حاصل ہے۔ دنیا کے اس حصے میں ایک نسلی اور نسل پرست ریاست قائم کرنے کا مقصد باقی ماندہ فلسطینیوں کو بھی نکال باہر کرنا ہے۔ حالیہ بننے والی دیوار کا ایک مقصد یہ بھی ہے۔ لیکن اس میں کامیابی مشکل ہے۔ جلد یا بدیر اسرائیل کے یہودی اس طرز زندگی کے خلاف بغاوت کر دیں گے۔ اس لیے کہ یہ زندگی کچھ بہت آسان نہیں ہے۔

MashalBooks.com

آپ نے الاندلس کے متعلق بہت لکھا اور بہت پڑھا۔ وہاں جزیرہ نما آئبیریا میں ایک امتزاجی تمدن موجود تھا۔ ان لوگوں کو نکال دیا گیا۔ مسیحیت اختیار نہ کرنے والوں کو قتل کر دیا گیا۔ تب یہودی وہاں سے کدھر گئے؟

تاریخ ستم ظریفیوں سے بھری پڑی ہے۔ جزیرہ نما آئبیریا کے پندرھویں صدی کو تناظر بنا کر میں نے ایک کتاب "Shadows of Pomegranate Trees" لکھی۔ اس کتاب کے لیے مواد اکٹھا کرنے کے دوران میرا واسطہ بڑی عجیب چیزوں سے پڑا۔ عمدہ باتوں میں سے ایک بہت اہم یہ تھی کہ وہاں عیسائی، مسلمان اور یہودی اکٹھے رہتے تھے اور ایک دوسرے سے متاثر بھی تھے۔ کیتھولک بنیاد پرستوں نے تہیہ کر لیا کہ اس کثیر امتزاجی تجربے کو ختم کر دیں گے اور یہودی اور مسلمان سے پاک یورپی تشخص کا حامل ملک بنائیں گے۔ مسلم سپین یا اندلس کی پوری تاریخ میں یہود دشمنی کا شاید ہی کوئی واقعہ موجود ہو۔ یہ لوگ بڑے آرام سے بستے تھے۔ انہیں مسلمان حکمرانوں نے بڑے بڑے عہدے دے رکھے تھے۔ یہ بات ہر کسی کو پتہ ہے۔

سابقہ اسرائیلی وزیراعظم کے باپ اور اسرائیلیات کے ایک بڑے عالم بن زیان نیتن یاہو نے پوری جانب داری کے ساتھ اور طویل عرصہ سپین میں یہودیوں کی عقوبت ڈھونڈنا چاہی لیکن ناکام رہا۔ البتہ میں بتا سکتا ہوں کہ مسلمانوں پر کہاں کہاں دارو گیر کی آزمائش ڈالی گئی۔ اچھا پھر، ایسی کون سی بات ہے؟ بات یہ ہے کہ وہ ایک مختلف عہد تھا جب مسلمان اور یہودی مل کر زندگی گزار رہے تھے۔ دیس نکالا ملنے کے بعد یہ لوگ مراکش اور استنبول چلے گئے۔ عثمانی سلطنت نے انہیں ایک بار پھر بطور منتظمین واپس عرب دنیا میں بھجوا دیا۔ دمشق میں بہت سی کمیونٹیاں عثمانیہ عہد میں بنیں۔ یہی اس معاملہ کا ستم ظریفانہ پہلو ہے۔

ایک بات سناتا ہوں جس کا تعلق یہودی سوال سے براہِ راست نہیں بنتا۔ ابھی چند ہفتے پہلے میں اپنی کتاب "Bush in Babylon" کے اجرا کے سلسلے میں سپین پہنچا۔ اسی وقت عراق سے اپنی افواج نکال لینے کا اعلان کرنے والی موجودہ حکومت کا آغاز ہونے کو تھا۔ اس سلسلے میں تقاریب ہو رہی تھیں۔ بڑا پرمسرت موقع تھا اور کچھ لوگ یورپ میں چلنے والی جنگ خلاف اس لہر کی کامیابی اور بلیئر اور بش کی ناکامی کا جشن منا رہے تھے۔ وہاں مجھے عراق کا ایک نقشہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ فرانکو کی جانشین اور سپین کی رجعت پسند حکومت نے عراق میں

سپین کے اڈے کو الاندلس کا نام دے رکھا تھا، مجھے غصہ آیا اور میں نے پریس میں اس کی مذمت کی۔ میں نے کہا تھا، ''تمہیں دنیا کے اس حصے میں چار پانچ سو سال تک جاری رہنے والے انسانی تجربے کا نام خراب اور استعمال کرنے کی جرات کیسے ہوئی۔ یہ غفلت اور خبط دونوں کی انتہا ہے۔ اگر افنار (Afnar) قدرے ایماندار ہوتا اور واقعی کچھ کرنا چاہتا تو اسے اپنے اڈے کا نام فرڈینینڈ اور ازابیلا کیمپ رکھنا چاہیے تھا۔ اسی طرح آرچ بشپ سز نیروز کا نام بھی استعمال میں آ سکتا تھا۔

> رچرڈ کوہن امریکہ میں قومی پیمانے کا کالم نگار ہے۔ ابھی پچھلے دنوں اس نے اپنی تحریر میں اس امر کی طرف توجہ مبذول کروائی ہے کہ اقوام متحدہ میں فلسطینیوں کے انسانی حقوق کی پامالی کے خلاف قرار داد مذمت تو فوراً پاس ہو جاتی ہے۔ لیکن مصر، سعودی عرب یا کسی دیگر عرب ریاست میں انسانی حقوق کی خلاف ورزی کے حوالے سے قرارداد پاس نہیں ہوتی۔ کیا خیال ہے؟

ان ریاستوں کی حکومتیں کس نے تشکیل دیں۔ میں تو سعودی شاہی گھرانے کے خاتمے پر بہت خوش ہوں گا۔ میری تمنا ہے کہ سعودی عرب میں جمہوری انتخابات ہوں۔ لیکن اس عمل کو کس نے روکا ہے۔ یہ کام امریکہ کا ہے۔ ظاہر ہے کہ اقوام متحدہ جیسا کمزور ادارہ یہ کام نہیں کر سکتا۔ سعودی عرب کے حوالے سے اقوام متحدہ کے پاس کوئی قوت موجود نہیں ہے۔

امریکیوں نے پہلی بار 11 ستمبر کے بعد سعودی عرب کے متعلق اپنی پالیسی پر قدرے ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان حملوں میں ملوث افراد کی بڑی تعداد کا تعلق سعودی عرب کے علاقے حجاز سے تھا۔ ان میں سے کوئی بھی غریب افغان دہقان نہ تھا۔ دو افراد کا تعلق ریاست ہائے متحدہ کے ایک قریبی حلیف ملک مصر سے اور باقی کا سعودی عرب سے تھا۔ سعودی عرب میں جمہوری راہ کی رکاوٹ کون ہے۔ یہ رکاوٹ اسلام نے نہیں ڈالی۔ انتخابات پر ان دونوں عرب ممالک کے اسلام پسندوں نے اظہار مسرت کیا ہوتا کیونکہ ان کے پاس جیتنے کے مواقع موجود ہیں۔

یہی وہ بات ہے جس کی طرف ہمارے دیرینہ دوست سام ہنٹنگٹن نے اشارہ کیا ہے اور اسے جمہوری قضیہ کا نام دیا ہے۔ جمہوری قضیہ کیا ہے؟ اس کا جواب دیتے ہوئے ہنٹنگٹن کہتا ہے کہ ''اگر ہم وہاں جمہوریت کو پنپنے دیتے ہیں تو نتائج ہماری پسند کے برعکس ہو سکتے ہیں۔

لیکن ظاہر ہے کہ جمہوریت میں تو لوگوں کو ان کی رائے میں آزاد کر دیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ نے مشرق وسطیٰ میں کبھی جمہوریت کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ کوہن اور اس جیسے بے شمار کالم نگار اس قسم کی یا وہ گوئی کرتے رہتے ہیں لیکن انہیں خبر نہیں کہ گزشتہ نصف صدی سے ان کا ملک وہاں کیا کر رہا ہے۔ یہ سارا نظام انہوں نے سامراجی مفادات کی خاطر چلایا ہے۔ اس کی اور کسے ضرورت تھی؟ کیا اہل کویت شیوخ کی حکومت چاہتے ہیں؟

فلسطین میں قوت اور عسکری حوالے سے زبردست عدم توازن موجود ہے۔ ایک کا پلہ دوسرے کے مقابلے میں بہت بھاری ہے۔ گاندھی نے ایک ایسی نوآبادیاتی قوت کے خلاف عدم تشدد کی تحریک چلائی تھی جو کم از کم دکھاوے کی حد تک قانون کی حکمرانی کی پابند تھی۔ برطانیہ کی طرح اسرائیل نے بھی قانون اور انسانی حقوق سے وابستگی کا نعرہ اختیار کیا ہے۔ کیا اس موقع پر فلسطینی عدم تشدد کا کارڈ کھیل سکتے ہیں؟ مثال کے طور پر اقبال احمد نے تجویز پیش کی ہے کہ گرد و پیش کے ممالک میں بسنے والے فلسطینی پناہ گزیں چلتے ہوئے اسرائیلی سرحد پر پہنچ جائیں اور کہیں ''ہم گھر جانا چاہتے ہیں۔''

اس طرح کے وقوعے کو عالمی اخبار فقط چار دن تک خبروں میں رکھیں گے۔ خیال اچھا ہے لیکن یہاں پر ذہن میں رکھنا ہوگا کہ ان کا سامنا ہندوستان کی برطانوی سلطنت سے نہیں بلکہ صیہونی رہنماؤں سے ہے۔ برطانیہ کی مجبوری تھی کہ اسے ہندوستان پر اپنی حکومت قائم رکھنے کے لیے اونچی سطح کے مقامیوں کی بڑی تعداد کی ضرورت تھی۔ کیونکہ یہی لوگ زمین اور کسان دونوں کو کنٹرول کر رہے تھے۔ جب قومی آزادی کی تحریک اٹھی اور کسان اس کے زیر اثر آئے تو معاملے کا آغاز ہوا۔ گاندھی کے سب سے بڑے مخاطب ہندوستانی کسان تھے۔

لیکن اسرائیل میں صورتحال بالکل مختلف ہے۔ اس کے پاس نیوکلیائی ہتھیار اور دنیا کی پانچویں بڑی فوج موجود ہے۔ یہ فوج مظاہروں کی اجازت تو دے سکتی ہے لیکن اگر یہی مظاہرے ایک بڑی عدم تشدد کی تحریک بن جاتی ہے تو اسے کچل دیا جائے گا۔

آپ کا کیا خیال ہے کہ خودکش حملہ آور اسرائیل کے ہاتھوں میں تو نہیں کھیل رہے؟

اس طرح ہے اور نہیں بھی۔ یہ طریقہ مجھے بھی کچھ بہت پسند نہیں لیکن بعض صیہونی رہنماؤں نے بھی کہنا شروع کر دیا ہے کہ ''فلسطینیوں کے بچوں کی پروا نہ کرتے ہوئے

MashalBooks.com

اسرائیلیوں کو کچھ تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ وہ نفرت میں شرابور آتے ہیں اور ہمیں ہماری فراریت کے مراکز میں ہمیں بم سے اڑا دیتے ہیں۔ چونکہ ان کی اپنی زندگیاں خطرے میں ہیں۔ چنانچہ وہ بھاری تفریحی سرگرمیوں کے مراکز میں خود کو اللہ کے حوالے کر دیتے ہیں۔ وہ ہمارے ریستورانوں میں اپنا خون بہاتے ہیں تاکہ ہماری بھوک مر جائے۔ اس لیے کہ ان کے اپنے گھروں میں بیٹھے بچے اور ان کے والدین بھوکے اور معتوب ہیں۔'' یہ سطور ابراہم برگ نے لکھیں جو فلسطینی پارلیمنٹ کا سابق سپیکر اور جیوئش ایجنسی کا سابقہ سربراہ ہے۔

اس نے یہ سب کچھ یہ جان لینے کے بعد لکھا کہ ''ان خودکش حملوں کا تعلق قبضے سے ہے جبکہ ان وقوعوں کی ساری رپورٹنگ دونوں حقیقتوں کو الگ کرتی ہے۔ ہمیں فلسطین پر قبضے کے حقائق کو سمجھنا ہوگا جو روزمرہ کے حقائق ہیں۔ جہاں فلسطینیوں کو گھنٹوں چیک پوسٹ پر روکا جاتا ہے اور ان کی تلاشی و تذلیل ہوتی ہے۔ وضع حمل کے وقت عورتوں کو ہسپتال نہیں لے جانے دیا جاتا اور اسقاط ہو جاتا ہے۔ یہ سب چیزیں یاسیت کی فصل بوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فلسطینی خودکش حملوں پر اتر آئے۔ مجھے بھی یہ حرکت پسند نہیں لیکن ان کا تعلق قبضے کی حقیقت سے ہے۔

کیا آپ سمجھتے ہیں کہ عراق پر امریکی حملے کا ایک فیکٹر اسرائیل بھی تھا؟

اسرائیل عامل تو تھا لیکن میں نہیں مانتا کہ یہ حملے کا غالب عامل تھا۔ یا یہ کہ جنگ کا اہتمام ہی اسرائیل نے کیا۔ اسرائیلی اس حکومت کو ختم تو کرنا چاہتے تھے کیونکہ انہیں باور ہو گیا تھا کہ اسی ایک حکومت میں بصورت مرضی ان کے خلاف کارروائی کی صلاحیت ہے۔ انہیں عراقی حکومت کبھی پسند نہیں تھی۔ محض اس لیے کہ یہ ایک خودمختار عرب ریاست تھی۔ ایران، عراق جنگ کے دوران بھی جب امریکہ اور برطانیہ عراق کا ساتھ دے رہے تھے تو اسرائیلی ایرانیوں کو چیفٹن ٹینکوں کے پرزے فراہم کر رہے تھے۔ مناہم بیگن سے پوچھا گیا، ''ایران، عراق جنگ میں آپ کہاں کھڑے ہیں؟'' اس نے کہا، ''جب گوئم (Goyim) دوسرے گوئم سے لڑتا ہے تو میں تو فقط بیٹھ کر ہلہ شیری دوں گا۔'' یہ بھی نہ بھولیں کہ 1981ء میں امریکی اجازت کے ساتھ اسرائیلیوں نے عراقی نیوکلیائی ری ایکٹر تباہ کر دیا تھا۔ اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ اسرائیلی عراق پر حملہ کرنا چاہتے تھے۔ واشنگٹن میں موجود اسرائیلی سفیر نے بھی تو یہی کہا تھا کہ ''اب کیوں رکتے ہو۔ آگے بڑھو اور شام اور ایران کے ساتھ مل کر کام ختم کر

دو۔'' ان کے اندازِ فکر میں کسی کو کوئی شبہ نہیں۔

اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ عراق پر حملے سے پہلے اعلیٰ اسرائیلی عہدیدار احمد شیلابی سے ملے جس نے انہیں یقین دلایا کہ اس کے چارج سنبھالتے ہی عراق اسرائیل کو تسلیم کر لے گا۔ آج کوئی بھی شخص خود شیلابی کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ چنانچہ وہ اس پوزیشن میں نہیں کہ اسرائیل کو تسلیم کروا لے۔ لیکن اس کے وعدے اسرائیلیوں کے لیے بہت خوش کن تھے اور اسی لیے انہوں نے حملے کی پشت پناہی بھی کی تھی۔

عراق پر امریکی قبضے کے نتیجے میں پرانا اور آزمودہ کار برطانوی فارمولہ برتا جا سکتا ہے۔ علاقہ میں اثر و رسوخ کے حامل مقامیوں کی ایک تہ تلاش کرو اور ان کے ساتھ معاملہ کر لو کہ وہ آپ کی حمایت اور تعاون جاری رکھیں گے۔ ظاہر ہے کہ اس کام میں وقت لگتا ہے اور اپنے زمانے میں برطانیہ نے بھی لگایا۔ امریکی بھی اس طرح کی سکیم اختیار کر سکتے تھے اور عراقی فوج کو سالم رکھے ہوئے اس سے مدد لے سکتے تھے۔ ہوسکتا تھا کہ سکیم کامیاب بھی رہتی لیکن انہوں نے اسے آزمایا نہیں۔ اس کی بجائے انہوں نے نوآبادکاری کے اسرائیلی طریقے اپنائے جس میں قصبوں، دیہاتوں اور خاندانوں کو سزا دینے کا عمل شامل ہے۔ مزاحمت کرنے والوں اور ان کے اہل خانہ کے گھر اور دیہات تباہ کرنا بھی اسی عمل کا حصہ ہے۔

اسرائیلیوں نے یہ سب کہاں سے سیکھا؟ انہوں نے یہ طریقے جرمن غاصبوں سے سیکھے۔ جرمنوں نے بھی جنگ عظیم دوم میں یہی کچھ کیا تھا۔ وہ بھی پورے پورے قصبوں کو سزا دیتے تھے۔ اس طریقے میں ظالمانہ تشدد، قوت اور دار و گیر سے حکومت قائم تو ہو جاتی ہے لیکن متزلزل اور غیر مستحکم رہتی ہے۔

اجتماعی سزا؟

جرمنوں نے اجتماعی سزا کا طریقہ اختیار کیا تھا۔ ویت نام کی جنگ میں امریکہ اسے نئی بلندیوں پر لے گیا۔ اسرائیل نے اسے فلسطینیوں پر آزمایا۔ اور اب امریکی عراقیوں پر استعمال کر رہے ہیں۔ امریکیوں نے اسرائیلی طرزِ کار تو اختیار کر لیا لیکن یہ کم ذہین ہیں اور خطا کھاتے ہیں۔ وہ عراق کو اسی نہج پر چلانا چاہتے ہیں۔ انہوں نے وہاں اپنے اڈے بنا لیے ہیں اور امریکی اموات کو کم از کم رکھنے کے لیے ان اڈوں پر پڑے رہتے ہیں۔ عراقیوں پر ضرب لگانے کی ضرورت ہوتی ہے تو ہوائی قوت کی آڑ میں یہ کام کرتے ہیں یہ طریقہ چلنے کا نہیں۔

MashalBooks.com

کیا آپ نے کبھی غور کیا ہے کہ 1948ء میں جو کچھ فلسطین میں ہوا اور اس سے ذرا پہلے برصغیر کے وقوعات میں ہوا کیسا تشاکل موجود ہے۔ یہاں بھی وہی سامراجی ہتھکنڈے استعمال ہوئے۔۔۔ نقشہ نویس بلوا کر نقشے بنوائے گئے؛ لوگوں کو الگ کر دیا گیا؛ نتیجتاً جنگیں ہوئیں۔ ابھی تک اسرائیل اور برصغیر دو کھلے زخم ہیں۔ اگر باہر خلا سے کھڑے ہو کر دیکھا جائے تو فلسطین اور کشمیر سے خون رستا دکھائی دے گا۔

مماثلتیں یقیناً موجود ہیں۔ جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ جب بھی سلطنتیں حکومت کرتی ہیں تو اپنے مفاد کے عین مطابق کرتی ہیں۔ آبادی کو تقسیم کیا جاتا ہے اور بالعموم یہ کام لسانی خطوط پر ہوتا ہے۔ ملک کو مناسب طور پر چلتا رکھنے کے لیے ہر طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ بالعموم اس مقصد کے لیے آبادی کے ایک حصے کو دوسرے کے خلاف برتا جاتا ہے۔ برطانیہ نے یہی کام برصغیر میں بڑی کامیابی سے کیا۔ لیکن حتمی نتیجہ ان کی توقعات اور پیش بینی سے باہر تھا یعنی برصغیر تقسیم ہو گیا۔

مزاحمت میں کلچر کے کردار پر بات کرتے ہیں۔ ہم نے پچھلے انٹرویو میں شاعری پر بات کی تھی۔ آپ نے جنوری 2004ء میں فوت ہونے والے عظیم ناول نگار عبدالرحمان منیف کا ذکر کیا تھا۔ آپ نے تو ''The Nation'' میں اس ناول نگار پر ایک مضمون بھی لکھا تھا۔ اس عہد کی عرب دنیا کے اس مؤثر ترین مصنف کے گزر جانے کا ذکر بھی صرف آپ نے کیا۔

نجیب محفوظ اور منیف کو عرب دنیا کے خداداد صلاحیتوں کے حامل ناول نگار کہا جا سکتا ہے۔ ان دونوں کے انداز نگارش اور طبائع میں خاصا فرق ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ محفوظ بھی عظیم ناول نگار ہے۔ لیکن میری رائے میں منیف ایک معاملے میں نسبتاً بہتر رہا کہ اس کا باپ سعودی اور ماں عراقی تھی۔ غالبًا اسی لیے منیف سعودی علاقوں سے اچھی طرح واقف تھا اور ساتھ ہی ساتھ عراقی علاقوں سے بھی۔ اس نے ''Cities of Salt'' کے نام سے ناولوں کا جو سیٹ لکھا وہ بے مثال ہے۔ پانچ ناولوں کے اس سیٹ میں سے تین کا ترجمہ انگریزی میں ہو چکا ہے لیکن دنیا کے بیشتر حصوں میں پیپر بیک میں دستیاب نہیں۔
ناول نے عرب دنیا میں وہی کردار ادا کیا جو انیسویں صدی کے یورپ میں کر چکا تھا۔

ناول معاشرت میں مداخلت کا ایک ذریعہ بن گیا۔ منیف یا محفوظ عرب دنیا میں اتنے ہی مؤثر اور پڑھے جاتے ہیں جیسے لاطینی امریکہ میں گارشیا مارکیز عرب دنیا میں سیاست اور کلچر کا یہ میل جول ہمیشہ بہت قوی رہا ہے۔ حتیٰ کہ اب جب یہ دنیا امریکی سیریز کو بار بار پیش کرنے اور ان کے مقامی رنگ تیار کرتے ٹی وی سے مغلوب ہوگئی ہے، ان ناولوں کا اثر موجود ہے۔

ریاست ہائے متحدہ میں خاصی ثقافتی سرگرمیاں مزاحمت کی اصطلاح میں ہو رہی ہیں۔ نامور ہپ ہاپ سنگر مائیکل فرانتی جیسے موسیقار موجود ہیں جنہوں نے امریکی مقتدرہ کے خلاف گانے گائے ہیں۔ نیو یارک کے پبلک تھیٹر میں ٹم روبنز نے ''Embeded'' کے نام سے ایک ڈراما پیش کیا ہے۔ کیا آپ کے برطانیہ میں بھی اس طرح کی سرگرمیاں ہو رہی ہیں؟ آپ آیت اللہ خمینی پر ایک اوپیرا لکھنا چاہتے تھے۔

یہ میرے ملتوی چلے آنے والے منصوبوں میں شامل ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ اس میں کچھ کامک اور کچھ سنجیدہ ہونا چاہیے۔ لیکن اس طرح کے ڈراموں کے لیے ایک بڑے ڈائریکٹر اور فلپ گلاس جیسے موسیقار کی ضرورت ہوگی۔ پچھلے سال میں نے ''Illustrious Corpse'' کے نام سے ایک ڈرامہ لکھا تھا۔ بلیئر اور اس کے کارناموں کے گرد لکھا گیا یہ ڈرامہ سنٹرل لندن اور لیکاسٹر میں چلا تھا۔ کابینہ کا ایک وزیر، ہوم سیکرٹری اور کالا سیاست دان مردہ پائے گئے۔ اس کی بیوی قتل کا اعتراف کرتے ہوئے کہتی ہے کہ ''مجھے پتہ چلا تھا کہ یہ دنیا کو خراب کرنے والا ہے۔'' یعنی وہ قرار دیتی ہے کہ اس نے اپنے شوہر کو حفظ ماتقدم کے طور پر قتل کر دیا۔ وہ لوگوں کو بتانا چاہتی ہے کہ اس نے یہ کیوں کیا۔ اس لیے کہ اس نے کسی بھی اصول کا خیال نہیں رکھا تھا۔ اس بیوی کو یقین تھا کہ جیوری اسے چھوڑ دے گی۔ پھر عدالت اس مقدمے کی کارروائی رکوانے کی کوشش کرتی ہے اور ڈاکٹر ذرائع ابلاغ کو بتاتے ہیں کہ وہ وزیر دل کے دورے سے مرا۔ بہت سے بچے اور نوجوان یہ ڈرامہ دیکھنے آئے اور یہ بڑی بات تھی۔ برطانیہ کے ایک میوزک بینڈ نے میری تقریروں کو موسیقی دی اور اگر میری یادداشت درست ہے تو نوم چومسکی کی ایک تقریر کو بھی جسے میں سننے کو بے تاب ہوں۔ بچے مجھے بتاتے ہیں کہ ''ہم نے آپ کی تقریر سنی، کیا آپ نے اس کے پیچھے بجتی موسیقی پر غور کیا۔'' لفظ کے بھرپور معنوں میں جرأت مند نوجوانوں کی بڑی تعداد موجود ہے جو عالمگیر سطح کی مزاحمت پیش کر رہے

ہیں۔ امریکہ میں ہونے والی مزاحمت بعض اوقات بہت دور نکل جاتی ہے اور اس کا بہت مثبت اثر پڑتا ہے۔

> ''الجزیرۃ''، ''العربیہ'' اور ایسے ہی دیگر آزاد عرب سیٹلائٹ نیٹ ورکس کا قیام بھی یقیناً ڈرامائی پیش رفت ہے۔

یقیناً ''الجزیرۃ'' دنیا میں ایک بڑی پیش رفت ہے۔ یہ ادارہ وہ کچھ کرتا ہے جس کا بی بی سی دعوے دار ہے یعنی یہ واقعی معروضیت پسند ہے۔ ان کے ہاں دلائل پیش کیے جاتے ہیں اور یہ دونوں طرف کے لوگوں کا انٹرویو کرتے ہیں۔ چونکہ ذرائع ابلاغ کا بڑا دھارا بڑے منظم طریقے سے حدود میں رکھا جاتا ہے اور یہ کام برطانیہ میں چالاکی سے اور امریکہ میں جبراً کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس طرح کے اداروں کو خطرہ سمجھا جاتا ہے۔ اگر آپ برطانیہ یا ریاست ہائے متحدہ میں ٹیلی ویژن خبریں دیکھتے ہیں تو بار بار وہی سرخیاں اور خبریں دیکھنے کو ملتی ہیں، اگر خبروں کا یوں انتظام نہ کیا جائے تو یہ لوگ اپنی من مانی کس طرح کر سکتے ہیں۔ وہ اسی ایک طریقے پر چلتے رہتے ہیں۔ ''الجزیرۃ'' اور کسی حد تک ''العربیہ'' نے یہ سانچا توڑا ہے۔ ان کے ہاں ان کی اپنی خبریں اور سرخیاں ملتی ہیں۔ اور یونہی انہوں نے مغربی ذرائع ابلاغ کے تسلط سے نکلنے کی کوشش کی ہے۔

اس طرز عمل کو ایک حقیقی خطرہ سمجھا جا رہا ہے۔ افغانستان میں ''الجزیرہ'' ٹیلی ویژن ہیڈ کوارٹر پر حملہ کیا گیا، اس کا ایک صحافی بغداد میں مارا گیا اور فلوجہ میں سرگرم ''الجزیرہ'' صحافیوں کو نشانہ بنایا گیا۔ مغرب صرف اسی کو صحافت مانتا ہے جو اس کے ہم قدم ہے: ''ہمارے ساتھ آؤ گے تو محفوظ رہو گے۔ ہمارے ساتھ نہیں آؤ گے تو مارے جاؤ گے۔ عرب ہو تو مرنا یقینی ہے۔ مغربی ہو تو پھر بھی محتاط رہو۔'' مجھے بڑی خوشی ہے کہ عراق میں باب فسک کو نقصان نہیں پہنچا۔ وہ بیشتر اوقات فیلڈ میں چلا جاتا ہے اور وہاں سے حیران کن رپورٹنگ کرتا ہے۔ ''الجزیرہ'' وجود میں آیا تو عرب دنیا کی صحافت بدل گئی۔ اب وہاں کوئی بھی سرکاری ٹیلی ویژن نہیں دیکھتا، قاہرہ ہو یا دمشق لوگ ''الجزیرہ'' دیکھتے ہیں۔ یہ سیٹلائٹ ڈش پر آ جاتا ہے۔ امریکہ میں بھی بہت سے لوگ ''الجزیرہ'' دیکھتے ہیں۔ جنگ عراق ہونے والی تھی تو ایک اندازے کے مطابق دو ملین لوگوں نے ''الجزیرہ'' دیکھنے کے لیے ادائیگی کی۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جنہیں عربی نہیں آتی لیکن انہیں آواز نہیں تو نئی تصویریں تو دیکھنے کو مل گئیں۔ یہ بہت مثبت

پیش رفت ہے۔

اب دیکھیں کہ یہ سلسلہ کب تک چلتا ہے۔ کیونکہ امریکہ اور ''الجزیرہ'' میں ایک بات مشترک ہے۔ دونوں کا اڈہ قطر میں ہے۔ امریکہ کا سب سے بڑا اڈہ ''العدید'' قطر میں ہے اور تھوڑے ہی فاصلے پر ''الجزیرہ'' کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ اس پر بعض لوگ سوچنے لگتے ہیں کہ یہ سلسلہ کب تک چلے گا اور کیا امریکی ''الجزیرہ'' کو دبانے کا طریقہ ڈھونڈ لیں گے۔

خود ہم نے امریکہ میں "Democracy Now" جیسے پروگرام چلتے دیکھے ہیں۔ لوگ انفارمیشن کے متبادل ذرائع کے لیے بے چین ہیں۔ فری سپیچ ٹی وی پھیل رہا ہے۔ کینیڈا میں چلنے والا ''کاؤنٹر سپن'' دنیا کے مختلف حصوں میں دیکھا جاتا ہے۔ ساٹھ کے عشرے سے لے کر اب تک چلی آنے والی مقتدرہ کی گرفت کمزور ہوتی نظر آتی ہے۔ اگرچہ ابھی تک ٹوٹی نہیں۔ اگرچہ مغرب میں ابھی تک اجارہ داری کی ٹکر کا متبادل نظام نہیں بن سکا۔ لیکن اب ان آوازوں تک رسائی ممکن ہو رہی ہے جو ابلاغ کے مرکزی دھاروں پر نہیں سنی جا سکتیں۔

> یہ اپریل کا مہینہ ہے جسے ٹی ایس ایلیٹ نے ''ظالم ترین مہینہ'' کہا ہے۔ اس ماہ عراق میں امریکی اموات سب سے زیادہ تھیں۔ اور عراقی بھی سب سے زیادہ مارے گئے یا زخمی ہوئے۔ درست تعداد کا پتہ نہیں کیونکہ پینٹا گون چھپا جاتا ہے۔ لگتا ہے کہ انہیں اس میں کوئی دلچسپی بھی نہیں۔ ابھی بغداد میں ہونے والی ایک حالیہ کانفرنس میں ایک عرب صحافی نے شہر فلوجہ سے ''الجزیرہ'' پر نشر ہونے والی تصاویر کے متعلق بات کی جن میں شہر کا محاصرہ کرنے والی امریکی فوج کے ہاتھوں قتل ہونے والے شہریوں کو دکھایا گیا تھا۔ امریکی جنرل مارک کمٹ نے سوال ہی مسترد کر ڈالا اور کہنے لگا کہ ''اگر تمہیں یہ سب دیکھنا مقصود نہیں تو چینل بدل دو۔''

اکیسویں صدی کے امریکہ کی حقیقت یہی ہے کہ اگر آپ کو کسی چینل پر آنے والی چیز پسند نہیں تو چینل بدل دیں۔ لیکن پھر آپ کو ایک وہی چیز نظر آئے گی۔ بروس سپر نگسٹین نے اپنے گانے ''57 چینلز'' میں یہی بات کہی ہے۔ اب عرب دنیا میں کم از کم ایک متبادل چینل تو موجود ہے۔

کمٹ پینٹا گون کا ترجمان ہے۔ عراقی شہریوں کی ہلاکت کے حوالے سے سوال کو اس طرح مسترد کرنے کا عمل بتاتا ہے کہ آپ انہی شہریوں سے کتنی نفرت کرتے ہیں جنہیں

بچانے کا دعویٰ کرتے ہوئے آپ نے ان کا ملک قبضا لیا ہے۔ اس میں تو کچھ تعجب کی بات نہیں۔ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ امریکی دستوں کے ہاتھوں فلوجہ کے شہریوں پر عائد ہونے والی سزا کے مناظر امریکی اور یورپی ٹیلی ویژن پر نہیں دکھائے جاتے۔ پینٹا گون کی طرح برطانوی وزارت دفاع بھی جنگی علاقوں تک رسائی کے حوالے سے بہت محتاط ہے تا کہ اس طرح کی تصاویر ٹی وی پر نہ آئیں۔ ابلاغ پر اس طرح کا کنٹرول جنگی کوششوں کا حصہ ہے۔ چونکہ مقتدر حلقے لوگوں کو قائل کرنے کے لیے ذرائع ابلاغ استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ ذرائع ابلاغ کو جنگ میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

ایک اور مسئلہ بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ جب عراق میں غیر ملکی کاروباریوں اور دیگر حضرات کو نشانہ بنایا جاتا ہے تو مغربی باشندے مضطرب ہو جاتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ ان لوگوں کو ناراض نہیں ہونا چاہیے۔ عراقی تو صرف یہ بتا رہے ہیں کہ یہ ہمارا ملک ہے اور ہم یہاں تمہاری کارپوریشنیں نہیں چاہتے اور ان کا بتانے کا یہ طریقہ بہت کارگر رہا ہے۔ بہت سی مغربی فرمیں اپنے لوگوں کو وہاں سے نکال رہی ہیں۔ کل میں لاس اینجلس ٹائمز کے کتاب میلے میں تقریر کر رہا تھا۔ ایک سینئر صحافی نکولس وان ہوفمین نے مجھے کہا، دیکھو، ہمیں فلوجہ میں مارے گئے لوگوں کے امیج دکھائے گئے ہیں۔ انہیں قتل کرنے سے پہلے کم از کم نچوڑا تو نہیں گیا۔ ان امیجوں کو نہ بھولو جو ہم نے اس ملک میں دیکھے ہیں—— افریقی امریکیوں کے جل کر کوئلہ بنے درختوں سے لٹکتے جسموں کے نیچے پکنک مناتے لوگوں کی تصویریں۔ مت بھولو کہ یہ وہی ملک ہے۔"

پس لفظ

چار اور سال:
امن؟ جنگ؟ ہر سال سالِ گزشتہ سے بدتر

امریکہ اس امر کی حیران کن مثال ہے کہ جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کے فروغ کے ساتھ سیکولرزم کا فروغ ضروری نہیں ہے۔

یورپ کی سرمایہ دارانہ تہذیب کا واحد حقیقی عالمگیر پہلو سائنس اور ٹیکنالوجیز کا فروغ ہے۔ اور امریکہ اس امر کی حیران کن مثال ہے کہ اس کے باوجود سیکولرزم کی ترویج لازم نہیں۔ ایک ایسے ملک میں جہاں 60 فی صد لوگ شیطان اور 89 فی صد غیر مرئی قوت پر ایمان رکھتے ہیں۔ بش کی انتخابی کامیابی نے مغربی یورپ اور امریکہ کے درمیان موجود فرق کو واضح کر دیا۔ یہ فرق سیاست اور اقتصاد کا نہیں بلکہ جنگ اور مذہب کا ہے۔ نومبر 2004ء میں امریکی میرین کے دستوں نے فلوجہ پر حملے کی تیاری کی تو ان دونوں کا ملاپ دیکھنے میں آیا۔ محاذ سے آنے والی رپورٹوں سے پتہ چلا کہ حملے کے لیے جمع ہونے والے فوجیوں نے ''عہد نامہ عتیق'' کے (فلسطینی دہشت گردوں کے خلاف لڑنے والے ڈیوڈ جیسے) ہیروؤں کی شان میں گیت گائے۔ عراقی مزاحمت کاروں کو شیطانی مخلوق قرار دیا۔ اور یسوع سے مدد کے طلب گار ہوئے۔ ان کے چیپلن ہونرن نے عبادت گزاروں کو بتایا کہ وہ عراقیوں کو جبر، ظلم اور قتل عام سے نجات دلانے کے لیے لڑ رہے ہیں۔ اور انہیں خدا کی تائید حاصل ہو گی۔ دستوں نے قطار بنائی تو ہورن نے ان پر مقدس تیل چھڑکا تاکہ وہ محفوظ رہیں اور ان حالات میں یہ عمل خاصا مناسب نظر آتا تھا۔ جس خدا نے انہیں جبر، عقوبت، قیدیوں کے قتل اور تشدد پر مجبور کیا وہ غالباً کوئی اور خدا تھا اور اسی کے حکم پر انہوں نے آزادی کے لیے لڑنے والے زخمیوں کے سروں

میں گولیاں ماریں۔

داخلی محاذ پر بھی خدا کا خوب دکھاوا کیا گیا۔ اس کی خاکی مخلوق نے تجربہ کار شیطان پرست کارل روب جیسے لوگوں کے ساتھ مل کر سدومیوں اور جنین کشوں اور ان کے دوست کیری کی مذمت میں طوفان کھڑا کر دیا اور جارج ڈبلیو بش کو کامیاب کرایا۔ 2000ء میں ایلگور نے پاپولر ووٹ میں اکثریت حاصل کی۔ اس بار فتح بڑی مسکت تھی اور ناقص انتخابات کے نتائج منوانے کے لیے سپریم کورٹ سے اثبات کی ضرورت نہ پڑی۔ مجموعی تناسب کم رہا ہوگا لیکن فتح بہرحال ہوئی۔

اگر جان کیری نے جنگ کے خلاف موقف واضح طور پر اختیار کیا ہوتا تو ہوسکتا ہے پھر بھی ہار جاتا لیکن امریکی شہریوں کو تعلیم کا موقع ملتا اور جب عراق میں صورت حال ابتر ہوتی تو امریکی کانگریس میں بش اور اس کے دوستوں کو گھیرنا آسان ہو جاتا۔ جنگ نے بجائے خود بش کے اعتبار کو زک پہنچائی لیکن کچھ زیادہ نہیں۔ ایک تلخ حقیقت یہ ہے کہ عراق میں امریکی جانی نقصان اتنا زیادہ نہیں تھا کہ عوام جنگ سے متنفر ہو کر منہ موڑ لیتے۔ یہی وجہ تھی کہ ایک صدر نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر ملک کو جنگ میں گھسیٹنے کے لیے بڑے تواتر اور بے شرمی کے ساتھ جھوٹ بولا اور منتخب بھی ہو گیا۔ اگر جنگ خطرناک رخ اختیار کر جاتی ہے جیسا کہ اگلے سال ہونے کا امکان بھی ہے تو بھی ریپبلکن ایک حزب اختلاف کی موجودگی میں ہی قیمت ادا کریں گے۔ شکست خوردہ ڈیموکریٹ ٹام ڈراشل جیسے لوگ کسی کام کے نہیں کیونکہ یہ موقع پرستی کے لیے بھی بدنامی کا داغ ہیں۔ ڈارشل نے اپنی انتخابی مہم میں بش کے ساتھ بغلگیری کی تصویر کی خوب تشہیر کی۔ ظاہر ہے کہ یہ ہم جنس پرستوں کی شادی کی نہیں بلکہ جنگ کے فروغ میں معاون ثابت ہوئی۔ یوں جنوبی ڈکوٹا کے باشندوں کو اصل پیغام مل گیا اور انہوں نے حقیقی مقصد کے لیے ووٹ دیے۔

جب کوئی حلقۂ انتخاب کسی کو شکست دینا چاہتا ہے تو یہ نہیں دیکھتا کہ اس کے مقابل کون ہے۔ اس سال کے اوائل میں ہندوستان کے ووٹروں نے دائیں بازو کی حکومت کو شکست دی اور حزب اختلاف کو منتخب کیا جس کی سربراہی ایک اطالوی عورت کے پاس تھی۔

ماضی میں یہاں بھی ویت نام میں ڈیموکریٹک پارٹی کی جنگ کا دفاع کرتے ہوئے ہمفرے نکسن کے ہاتھوں ہارا۔ حالانکہ وہ بھی بالآخر جنگ ختم کرنے پر مجبور ہو گیا اور اس فیصلے میں التوا بھی واٹر گیٹ کا ایک عنصر تھا۔ اس سے پہلے جنگ کوریا کے معمار ہیری

ٹرومین نے دوبارہ انتخاب نہ لڑنے کا فیصلہ کیا اور ڈیموکریٹک امیدوار سٹیوئسن کو آئزن ہاور کے ہاتھوں شکست ہوئی حالانکہ وہ بھی بالآخر جنگ بندی اور امریکی فوجیں واپس نکالنے پر مجبور ہو گیا۔ اس بار بش نے اسامہ بن لادن اور بعض سماجی ثقافتی مسائل کو استعمال کرتے ہوئے رجعتی ووٹ دہندگان میں تحرک پیدا کیا۔

بش کی حقیقی کامیابی اس سراسیمگی میں پنہاں تھی جس کا اظہار الیکشنوں سے پہلے اور بعد میں ڈیموکریٹوں نے کیا۔ ان کا نمائندہ کیری خاصا کمزور تھا۔ ویت نام کی جنگ کا ریکارڈ اور شکاری ہونا اس کی شخصیت کو تقویت نہ دے سکا۔ شکست کے بعد ڈیموکریٹ لائن کی طرف دوڑے اور انہوں نے دشمن کے میدان میں ہجوم کر دیا۔ انہوں نے اسقاط حمل کے مخالف ایک مورمن ہیری ریڈ کو سینیٹ میں اپنا اقلیتی قائد منتخب کیا ہے۔ نہایت غیر متاثر کن اس شخص کا قائد منتخب ہونا ریپبلکنوں کا بڑا غلط سیاسی فیصلہ ہے۔ انہیں محتاط رہنا ہوگا۔ اگر انہیں اپنے اگلے کانگریسی انتخاب میں ریڈ سے مدد ملتی بھی ہے تو کارل دو ہم جنسوں کی شادی کی مہم پر اتر آئے گا۔ انہوں نے جس انداز میں اپنے حریفوں کا سوشل ایجنڈا اپنایا ہے وہ قطعی لاحاصل رہے گا اور بائیں بازو کے لبرل کسی تیسری جماعت کی طرف مائل ہونے لگیں گے۔ اگر ڈیموکریٹ سوشل سیکیورٹی کی نج کاری کی مخالفت نہ کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں تو بطور حزب اختلاف وہ 2004ء سے بھی کہیں زیادہ غیر متعلق ہو کر رہ جاتے ہیں۔

ڈک چینی جیسے دائیں بازو کے لوگوں کا پیش کردہ سوشل ایجنڈا روائتی ریپبلکنوں کے لیے باعث تشویش ہے۔ ران سسکنڈ کے مضمون "The Price of Loyalty" سے یہی ظاہر ہوتا ہے۔

ڈیموکریٹوں کے پاس موجود راستہ بڑا واضح ہے۔ یا تو انہیں اس سارے عمل کی مخالفت کرنا ہوگی یا پھر انہیں کلنٹنی ریپبلکن ایجنڈے کو زیادہ بہتر صورت میں پیش کرنا ہوگا۔ ٹونی بلیئر نے یہی کچھ کیا اور اسے تیسرے راستے کا نام دے کر ٹیچریوں کو شکست دینے میں کامیاب رہا۔ اس عمل میں بلیئر نے برطانیہ میں کنزرویٹو پارٹی کو کمزور کیا اور اس کی جگہ نیو لیبر کو لے آیا جو ریپبلکنوں کی حریف ہے۔ لیکن کلنٹن یہ کام امریکہ میں اس سے پہلے کر چکا تھا اور فقط جزواً کامیاب رہا تھا۔ اس کے دوبارہ کارگر ہونے کا امکان نہیں۔

بائیں بازو کے دھڑوں اور گرینز کو ملا کر بھی کسی متبادل قیادت کے امکانات موجود نہیں ہیں۔ حالیہ انتخابات میں دائیں بازو کی طرف جھکاؤ نے نیڈر کا صفایا کر دیا ہے۔ یہ حل

MashaiBooks.com

کیسا ہی عمدہ کیوں نہ ہو لیکن اس کے آثار ماضی قریب میں نظر نہیں آتے۔ اس اثنا میں جنگ اور احیائے نو پانے والے بش لوگوں کے سماجی، اقتصادی اور ثقافتی ایجنڈے کے مخالفین کو اپنی جگہ پر ٹھہر کر لڑنا ہوگا۔ انتخاب ختم ہو جانے کے بعد ضرورت ہے کہ مووااون (Move On) کو عراق میں جنگ کے خلاف مہم چلانا ہوگی اور دستوں کو واپس لانے کا مطالبہ کرنا ہوگا۔

ویت نام کے وزیر اعظم مرحوم پھین ڈوانگ کا کہنا تھا کہ واٹر گیٹ کو جانے والا راستہ جنوبی ویت نام کے شہروں اور جنگلوں سے ہوتا ہوا گزرا ہے۔ تاریخ خاصی بے اعتباری شے ہے لیکن امریکہ میں تبدیلی غالباً بغداد کی پُر پیچ گلیوں اور فلوجہ میں ہونے والے واقعات کے سبب آئے گی۔ بش نے ملکی انتخاب جیت لیا ہے لیکن اسے خارجی محاذ پر شکست ہوگی۔ مجھے اس کی امید ہے۔

MashalBooks.com